ماہنامہ

ندائے اعتدال

علی گڑھ

جنوری ۲۰۱۸ء | جلد ۹ | شمارہ ۷ | ربیع الثانی ۱۴۳۹ھ

بانی: ڈاکٹر محمد غیاث صدیقی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

زیر سرپرستی

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی

(صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ)

زیر نگرانی

ڈاکٹر سعد ماحی

(سکریٹری علامہ ابوالحسن علی ندوی ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر فاؤنڈیشن)

مدیر

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

tariqnadwialig@yahoo.co.in, Mob.9897776652

معاون مدیر

محمد فرید حبیب ندوی

مجلس مشاورت

- مولانا سید سلمان الحسینی ندوی
- مولانا بلال عبدالحی حسنی ندوی
- مولانا محمد الیاس ندوی بھٹکلی
- ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی
- محمد قمر عالم لکھنوی
- ڈاکٹر جمشید احمد ندوی
- مولانا محمد اخلاق ندوی

مجلس ادارت

- پروفیسر مسعود خالد علیگ
- مجیب الرحمٰن عتیق ندوی
- محمد قمر الزماں ندوی

سرکولیشن انچارج

سعید احمد ندوی 9808850029

محمد آصف اقبال ندوی 9454210673

شرح خریداری

فی شمارہ:	25:00 روپے
سالانہ:	250:00 روپے
سالانہ اعزازی ممبرشپ:	500:00 روپے
بیرونی ممالک:	30$ ڈالر
لائف ممبرشپ (۲۰ سال):	4000:00 روپے

خط و کتابت کا پتہ: مدرسۃ العلوم الاسلامیہ، ہمدرد نگر 'ڈی' کوارسی بائی پاس، علی گڑھ 202002

e-mail: nidaeaetidal@gmail.com, visit us: www.nadwifoundatioaligarh.org

Editor: Dr. M. Tariq Ayubi Nadwi

سعید احمد ندوی نے آئیڈیل گرافکس انٹر پرائزیز، علی گڑھ سے چھپوا کر دفتر علامہ ابوالحسن علی ندوی ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر فاؤنڈیشن، ہمدرد نگر ڈی، علی گڑھ سے شائع کیا

Printed & Published by Saeed Ahmad Nadwi behalf of the office of Allama Abul Hasan Ali Nadwi Educational & Welfare Foundation Hamdard Nagar-D, Jamalpur, Aligarh at *Ideal Graphics Enterprises*, Patwari Nagla, Aligarh

Dsg. & Comp. by: Abdur Rehman Araria, # arehman412@yahoo.in

فہرست مضامین

۱۔	قرآن کا پیغام	اہل ایمان میں فواحش ومنکرات کا رواج	حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ	
۲۔	اداریہ	فکری زاویے	مدیر	۳
۳۔	پیام سیرت	تندیٔ باد مخالف نہ گھبرا اے عقاب!	محمد فرید حبیب ندوی	۱۳
۴۔	پس منظر	عہد حاضر کا سانحہ کربلا	پروفیسر محسن عثمانی ندوی	۱۶
۵۔	خاص تحریر	فلسطین وعدۂ بالفور سے وعدۂ امریکہ تک	مجیب الرحمٰن عتیق ندوی	۱۹
۶۔	اسلامی تعلیمات	امت محمدیہ کا خاص اعتدال	مفتی محمد شفیع صاحبؒ	۲۷
۷۔	فقہی مقالات	سرکاری اسکیموں سے استفادہ اور حکم شریعت (آخری قسط)	مولانا محمد قمر الزماں ندوی	۳۲
۸۔	نقطۂ نظر	شاہ سلمان اکیڈمی برائے حدیث کا قیام	ترجمہ: محمد شعیب ندوی	۳۷
۹۔	تعلیم و تربیت	تربیت اولاد- چند اہم گوشے	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی	۴۱
۱۰۔	انکار حدیث	قدیم منکرین حدیث	محمد فرید حبیب ندوی	۴۷
۱۱۔	فکر اسلامی	مفکر اسلام-ایک مطالعہ (قسط-۲۲)	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی	۵۲
۱۲۔	شخصیات	جسٹس محمد تقی عثمانی اور ان کی نظم ونثر	ندیم احمد انصاری	۵۶
۱۳۔	تعارف و تبصرہ	دانش راہ بین	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی	۶۰
		اتالیق بی بی	ڈاکٹر محمد فرقان سنبھلی	۶۲
۱۴	شعر و ادب	حادثۂ بیت المقدس	کلیم احمد عاجزؒ	

❁ ❁ ❁

نوٹ: مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔عدالتی چارہ جوئی علی گڑھ کی ہی عدالت میں ہوسکتی ہے۔

فکری زاویے

مسجد اقصیٰ اور مسلم ممالک کا کردار

۶ر دسمبر کی تاریخ ہم ہندوستانی مسلمانوں کے لئے یوں ہی بڑی کربناک ہے، شکست وزخم خوردگی اور اہانت وکمزوری کی ایک المناک داستان اس سے وابستہ ہے، دیکھا جائے تو اس کا تعلق اگرچہ خاص طور پر ملت اسلامیہ ہندیہ سے ہے، لیکن کہیں نہ کہیں یہ واقعہ پورے عالم اسلام کو جھنجھوڑنے کے لئے کافی ہے، عالم اسلام کی کمزوری ہی تو تھی جو سرِ عام جھوٹ بول کر مسجد شہید کی گئی اور پھر ملک گیر پیمانے پر قتل عام ہوا لیکن کہیں سے کوئی چوں کی آواز نہ آئی، اس کے برخلاف کہیں کوئی مسیحی قتل ہو جاتا تو پورا عالم اسلام مظاہرے کرتا ہے، پیرس حادثہ کے بعد ہمارے ملک کی بڑی ملی تنظیم نے بھی کئی سو شہروں میں ایک ساتھ مظاہرے کیے تھے، خیر کہنے کو تو بابری مسجد کی شہادت صرف ہندوستانی مسلمانوں کا قضیہ تھا، لیکن اس مرتبہ ۶ دسمبر ۲۰۱۷ء کو ملت اسلامیہ کے لہولہان جسم میں ایک ایسا نشتر لگایا گیا جس کا تعلق واقعی پوری ملت اسلامیہ سے ہے، امریکہ کے بدنام زمانہ صدر ٹرمپ نے اپنا یہ فیصلہ سنایا کہ وہ اپنا سفارت خانہ تل ابیب سے القدس منتقل کرے گا، اس نے القدس کو فلسطین کا پایہ تخت نہیں بلکہ اسرائیل کے دار الحکومت کے طور پر تسلیم کیا، شہر القدس پر مسلمانوں کا تاریخی، شرعی، قانونی اور عقلی ونسلی استحقاق ہے، لیکن تمام تر حقائق کو نظر انداز کرتے ہوئے ٹرمپ نے غاصب حکومت کو وہ بھی دے دینے کا اعلان کر دیا جس کی خاطر تقریباً ایک صدی سے فلسطینی اپنے لختہائے جگر کو قربان کر رہے ہیں، اور عالم اسلام اور خصوصاً عالم عربی کی سرد مہری بلکہ ان کے پرفریب کردار کے باوجود اپنا خون دے دے کر مسجد اقصی کی حفاظت کا سامان کر رہے ہیں۔

اب تک بیت المقدس اور مسجد اقصی کے سلسلہ میں متعدد مضامین آ چکے ہیں، اس لیے ہم یہاں نہ مسجد اقصی کی فضیلت بیان کرنا چاہتے ہیں اور نہ اس سے اپنے تعلق اور اس پر اپنے استحقاق کے دلائل دینا چاہتے ہیں، (ا) ہم تو سیدھے سیدھے یہ عرض کرتے ہیں کہ مسجد اقصی ہمیشہ مسلمانوں کی رہی، حضرت سلیمانؑ نے اس مسجد کی تعمیر نو کی تھی جبکہ اولین تعمیر حضرت آدم نے کی تھی، حدیث کے مطابق مسجد حرام اور مسجد اقصیٰ کی تعمیر کے درمیان ۴۰ سال کا فاصلہ ہے، حضرت سلیمانؑ کے متبعین مسلمان تھے، اس غلط فہمی کو دور کر لینا چاہیے کہ مسلمان صرف ہم ہی ہیں، ہمارا ہی دین اسلام ہے، حضرت آدم سے لے کر حضرت عیسیٰ تک جتنے انبیاء ورسل آئے وہ سب اسلام ہی لے کر آئے، آخری نبی حضرت محمد ﷺ اسلام کا آخری ایڈیشن لے کر آئے، یہ اسلام کا کامل ومکمل اور قطعی وحتمی ایڈیشن ہے، اس لیے مسجد اقصیٰ جب تعمیر کی گئی تو اس کو اسلام کے ماننے والے مسلمانوں نے تعمیر کیا، حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ کے ماننے والے جب تک مسلمان رہے ان کا اس پر مکمل استحقاق رہا، لیکن جب انھوں نے یہودیت اور مسیحیت کا نام اختیار کر لیا اور مسلمان ہونے کی بنیادی اور حتمی شرط یعنی قرآن اور صاحب قرآن ﷺ کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تو پھر ان کا مسجد اقصی پر کوئی استحقاق نہیں رہا، فی

(ا) یہ تمام چیزیں جس کو پڑھنا ہو وہ راقم کے ترجمہ کیے ہوئے مختصر کتابچہ ''مسجد اقصیٰ سے متعلق چالیس حقائق'' میں پڑھ لے، ندائے اعتدال کے شمارہ ۳، ج ۹، ستمبر ۲۰۱۷ء میں بھی اس کو شائع کیا گیا تھا، اس کے علاوہ بھی اردو میں اس موضوع پر قابل قدر کتابیں تیار کی گئی ہیں، وہاں مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

الحقیقت یہودی مسجد اقصیٰ کو مسمار کر کے اس کی جگہ ہیکل دجالی قائم کرنا چاہتے ہیں، اور مسیحیوں کو اس سے اس لئے عقیدت ہے کیوں کہ وہ وہاں نزول مسیح کے منتظر ہیں، یہ اور اس طرح کے بعض آثار و قرائن کی بنیاد پر یہود و نصاری بیت المقدس پر اپنا دعوی ثابت کرتے ہیں جن کا اسلامی نقطہ نظر سے کوئی استحقاق نہیں۔

ٹرمپ کے اس اعلان سے قبلہ اولیٰ سے قانونی و شرعی و جذباتی اور عقیدے کا تعلق رکھنے والوں میں اضطراب کی لہر دوڑ گئی، ظاہر ہے کہ یہ کوئی معمولی اعلان نہ تھا اس لئے لوگ اپنی جانیں فدا کرنے کو تیار ہو گئے، جیالوں کی جماعت حماس نے پھر مورچہ سنبھالا، ۷؍دسمبر کو اسماعیل ھنیہ کا خطاب انٹرنیٹ کے ذریعہ ہم سب تک پہنچا، جس کے لفظ لفظ سے ایمان وعزیمت کا نور ٹپک رہا تھا، پوری دنیا میں ٹرمپ کے اس فیصلہ کے خلاف مظاہرے ہوئے، ہر سطح پر احتجاج درج کرایا گیا، لیکن سعودی عرب، امارات اور مصر و بحرین وہ ممالک تھے جو خاموش تماشائی رہے، اس فیصلہ کا اعلان ان ملکوں کو اعتماد میں لے کر ہی کیا گیا ہے، جس کے دلائل واضح طور پر منظر عام پر آچکے ہیں، نیویارک ٹائمز نے خبر رساں ایجنسی رائٹر کے حوالے سے یہ خبر شائع کی کہ اعلان سے پہلے اس فیصلہ کی اطلاع سعودیہ و مصر کو دی گئی اور ان سے منظوری بھی حاصل کی گئی، ظاہر ہے کہ سعودیہ، مصر اور اردن وغیرہ ایسے ممالک ہیں جو امریکہ پر ہی منحصر ہیں وہ اس کے خلاف کوئی فیصلہ کر سکتے ہیں اور نہ اقدام کرنے کی سکت رکھتے ہیں، لیکن اب بھی کچھ معذور لوگ (جن کو عقل و بصیرت دونوں اعتبار سے معذور ہی کہا جاسکتا ہے) ان ممالک کے ستھرے کردار یا ان کی جانب سے کسی معجزے کی امید لگائے بیٹھے ہیں، ٹرمپ کا دورہ ریاض اور وہاں سے تل ابیب کا سفر اس اعلان کی تمہید تھا، ہم نے اس وقت لکھا تھا کہ اب آئندہ بہت سخت مرحلہ آنے والا ہے۔

۱۹۱۷ء میں برطانیہ نے یہودیوں سے یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ فلسطین میں ان کو وطن بنا کر دے گا، جو "وعدہ بالفور" کے نام سے تاریخ میں رکارڈ ہے، ۱۹۴۸ء میں اسرائیل کا قیام عمل میں آیا، اس سے قبل ۱۹۴۵ء کی اہم خفیہ ملاقات کا بھی انکشاف بعد میں ہوا جو سمندر کی فضا میں انتہائی خاموشی سے سعودی شاہ اور امریکی صدر کے درمیان ہوئی، ۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ بعض منافقین کی سازش سے محض اسرائیل کے غلبہ و تسلط کو مکمل کرنے بلکہ بعض اور علاقے اس کو دینے اور پورے خطہ میں اس کا اثر و رسوخ قائم کرنے کے لئے لڑی گئی، اس وقت خطۂ فلسطین کا تقریباً ۸۷ فیصد حصہ اسرائیل کے قبضہ میں ہے، ۱۹۱۷ کے ٹھیک سو سال پورے ہونے پر ۲۰۱۷ء میں فلسطین کی ہزاروں سال پرانی تاریخ کو ٹھکراتے ہوئے امریکہ بہادر نے یروشلم یعنی بیت المقدس کے غاصب اسرائیل کی راجدھانی ہونے کا اعلان کر دیا، اس اعلان نے صرف اسلامی ضمیر کو ہی نہیں انسانی ضمیر کو بھی جھنجھوڑ کر رکھ دیا، جس کی شہادت اس سے ملتی ہے کہ پوری دنیا میں اس فیصلہ کے خلاف مظاہرے ہوئے، اس موقع پر ملت اسلامیہ کے قائد رجب طیب اردوغان نے دوٹوک الفاظ میں بیان دیا، ان کے جملے اور ان کے الفاظ سیاسی نہیں بلکہ خالص مومنانہ جذبہ کے ترجمان تھے، ان کے فوری ردعمل کے طور پر جو بیان آیا وہ بالکل غیر سیاسی تھا، سیاسی بیان تو وہ تھا جو "الدب الداشر" (۱) کے معذور ابا حضور نے دیا تھا کہ ٹرمپ کے اس فیصلہ سے خطہ میں امن کی کوششوں کو نقصان پہنچے گا، بے چارے معلوم نہیں اس حقیقت سے یکسر نابلد ہیں یا تجاہل سے کام لیتے ہیں کہ خطہ میں اسرائیل کا وجود ہی امن و امان کو تاراج کرنے کے لیے کافی ہے، ہاں اگر اس بیان کا مطلب یہ ہے کہ اس بیان کے بعد عوامی اضطراب سے ان

(۱) عرب حضرات سوشل سائٹس پر محمد بن سلمان کے غیر ذمہ دارانہ بلکہ انتہائی آمرانہ رویوں اور فیصلوں کی وجہ سے اس کو "الدب الداشر" یعنی آوارہ ریچھ کے نام سے یاد کر رہے ہیں۔

کی کرسی کی چولیں ہل سکتی ہیں تو یہ ممکن ہے، رجب طیب اردگان نے صاف کہا کہ ہم اس فیصلہ کو یکسر ٹھکراتے ہیں، شہر قدس فلسطین کی راجدھانی تھا، ہے، اور رہے گا، انھوں نے کہا کہ ہم کمزور ضرور ہیں لیکن ہمارے ضمیر مردہ نہیں ہوئے، ہم دکھائیں گے کہ ہم اقصی کو کس طرح واپس لیں گے، انھوں نے اس موقع پر انتہائی جرات مندی کے ساتھ اسرائیل کو دہشت گرد ریاست قرار دیا اور بار بار قرار دیا، اور اس کی وجہ یہ بیان کی اسرائیل بچوں اور عورتوں اور بے گناہ و نہتے انسانوں کو قتل کرنے والی ریاست ہے، اسرائیل کا وزیر اعظم اس بیان پر بہت چراغ پا ہوا، تو اردوغان نے اپنی دوسری تقریر میں مزید کہا کہ لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ اسرائیل کو دہشت گرد کیوں کہتا ہوں، انھوں نے ایک تصویر دکھائی جس میں ایک چودہ سالہ فلسطینی نوجوان کی آنکھ پر پٹی بندھی ہوئی ہے اور اسے ۱۴/اسرائیلی فوجی گھسیٹ رہے ہیں، انھوں نے کہا کہ جو قوم ایک بچے پر اتنے فوجی چھوڑے وہ دہشت گرد بھی ہے اور بزدل بھی، اردوغان نے OIC، Orgnazation of Islamic coopretion منظمة التعاون الاسلامی کا ہنگامی اجلاس بھی طلب کیا، اس وقت OIC کی صدارت ترکی کے پاس ہے، ۱۳/دسمبر کو استنبول میں منعقد اس سربراہ کانفرنس میں بھی اردوغان نے مسلم سربراہوں کو جگانے کی بھرپور کوشش کی، پوری قوت اور جوشِ ایمانی کے ساتھ خطاب کیا، امریکہ کی شدید تنقید اور بھرپور مذمت کی، انھوں نے اس موقع پر بھی اسرائیل کو دہشت گرد ریاست قرر دیا اور مزید کہا کہ اس اعلان کے بعد امریکہ نے انتہا پسندی کی ساری حدیں پار کردی ہیں، انھوں نے قبلہ اول کو سرخ لکیر Red line قرار دیتے ہوئے کہا کہ اس پر مسلمانوں کا حق دائمی ہے، مسلمان آزاد و خودمختار فلسطینی ریاست کے مطالبہ سے دست بردار نہیں ہو سکتے، ان کا ایک بیان یہ بھی آیا کہ اگر ہم مسجد اقصی کی حفاظت نہ کر سکے تو مکہ و مدینہ کو کیسے بچا پائیں گے، اس سے قطع نظر کہ اس کی حفاظت کا ذمہ اللہ نے لیا ہے اردوغان کا یہ بیان مسئلہ کی خطرناکی کو واضح کرتا ہے، اور دعوت غور وفکر دیتا ہے، OIC کا قیام ۱۹۶۹ء میں اس وقت ہوا تھا جب یہود بے بہبود نے قبلہ اول کو آگ کے حوالے کرنے کی کوشش کی تھی، اس اجلاس میں ۲۵ مسلم ممالک کے سربراہان شریک ہوئے، سعودی عرب، امارات، مصر اور بحرین کے سربراہ خود کیا جاتے انھوں نے اپنے اس وزیر کو نمائندگی کے لئے بھیجا جس کو خود ان کے ملک میں بے حیثیت سمجھا جاتا ہے، اس انتہائی اہم اور حساس مسئلہ پر گفتگو کے لیے مذہبی امور کے وزیر کی شرکت چہ معنی دارد؟ ٹرمپ کے سامنے تو سعودیہ نے ۵۶ ممالک کے سربراہوں کو اس لیے جمع کردیا تھا کہ وہ سب کی موجودگی میں اسلام اور مسلمانوں کو دہشت گرد قرار دے مگر قبلہ اولی کے ہاتھ سے جانے پر اس کا یہ کردار رہا، ان چار ممالک کے اس رویہ نے اس خبر کو صحیح ثابت کردیا کہ ٹرمپ کا یہ اعلان ان کو اعتماد میں لے کر کیا گیا، ان چاروں ممالک کا اتحاد قطر کے بائیکاٹ کے وقت قائم ہوا تھا، یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ مسلمانوں کے انتشار سے ہی قبلہ اولی ہاتھ سے گیا، ان کی ناعاقبت اندیشی سے ہی خلافت عثمانیہ کو تاریخ کے صفحات میں دفن کیا گیا، جس کی کمی آج پوری دنیا کے مسلمان محسوس کرتے ہیں، کتنے بیدار مغز تھے ہندوستان کے وہ علماء جنھوں نے خلافت تحریک چلائی تھی، جب تک خلافت تھی تب تک مسجد اقصی مسلمانوں کے قبضہ میں تھی، اہل یورپ اچھی طرح سمجھ گئے تھے کہ خلافت کے رہتے ہوئے فلسطین میں یہود بے بہبود کو ایک انچ زمین بھی نہیں مل سکتی، اس لیے پہلے خلافت کو ختم کیا، حسین بن علی شریف مکہ اور آل سعود نے اس مہم میں بھرپور ساتھ دیا، پھر جب وقت نے انگڑائی لی مصر میں ایک ایسی حکومت قائم ہوئی جس کے وجود سے اسرائیل کے وجود پر لرزہ طاری ہوا، جس کے استحکام سے شام میں اسلام پسندوں کے غلبہ کا امکان روشن ہوا تو ظالموں نے اس

حکومت کو اکھاڑ پھینکا اور شام میں روشن ہوئے امکانات کو طویل مدت کے لیے تاریک وتاراج کر دیا، اس موقع پر سعودیہ وامارات کے کردار پر ہم مفصل ومدلل اور بھرپور تبصرے کر چکے ہیں۔

امریکہ کو خوب معلوم تھا کہ اس کے اس اعلان سے اس کا کچھ نہیں بگڑنے والا، کیوں کہ وہ عالم اسلام کے انتشار سے خوب واقف ہے، جس کا ثبوت سعودی اتحاد کے سربراہوں نے اس سربراہ کانفرنس سے غیر حاضر رہ کر بھی دے دیا، جب عالم اسلام کو رجواڑوں میں تقسیم کیا گیا تھا تو مغرب کے پیش نظر یہی تھا کہ یہ کبھی آپس میں متحد نہ ہو سکیں ورنہ ان کے پاس جو قوت ہے اس کے بل پر یہ کبھی بھی پلٹ وار کر کے یہ لوگ مغرب کو زیروزبر کر سکتے ہیں، مگر اب تو صرف عیش پسندی اور خاندانی حکومت کو باقی رکھنا ہی اصل مقصد ہے، اسی کے لئے سارا انتشار ہے، قبلہ اول ہاتھ سے جاتا ہے تو بلا سے جائے اپنی کرسی اور سامان تعیش تو سلامت ہے۔

اخوانی حکومت کو ختم کرنے اور عرب بہار یہ کو ناکام بنانے کا اقدام اس لیے کیا گیا تھا کیوں کہ فتح بیت المقدس کا راستہ مصر وشام سے ہو کر جاتا ہے، صلاح الدین ایوبیؒ کو اتنی طویل جنگ مصر وشام میں مسلمانوں کی طوائف الملوکی اور ان کے انتشار کے سبب ہی لڑنا پڑا تھا، ورنہ وہ بہت مختصر مدت میں فتح یاب ہوتے، آج بھی ان رجواڑوں کے راجے مہاراجے وہی کردار ادا کر رہے ہیں، اس کردار کی سربراہی سعودیہ وامارات کی حکومتیں کر رہی ہیں، اب یہ حقائق ڈھکے چھپے نہیں رہ گئے، ٹرمپ کا ایک داماد صہیونیت کا نمائندہ اور علمبردار ہے، محمد بن سلمان اور محمد بن زاید کے اس سے بہت گہرے مراسم ہیں، ٹرمپ کے اس فیصلہ کے اعلان سے کچھ دن قبل محمود عباس کے دورۂ ریاض پر محمد بن سلمان نے ابو دیس کو مرکز بنانے اور القدس کو اسرائیلی دارالحکومت تسلیم کرنے پر زور دیا تھا، مگر محمود عباس سوداگروں سے اپنی تمام تر وفاداریوں کے باوجود فلسطین کے سرفروش وباحمیت عوام کو ملحوظ رکھتے ہوئے خود اس کی ہمت نہیں کر سکتا تھا، OIC کی اس کانفرنس سے دو دن قبل بحرین نے اظہار یکجہتی کے لیے اسرائیل اپنا ایک وفد بھیجا، اگرچہ ان سب نے میڈیا کے ذریعہ عوام کو مطمئن کرنے کے لئے پرفریب الفاظ واصطلاحات کا استعمال کرتے ہوئے بیانات بھی دیے، جس کے سبب بھولے بھالے یا مکر ودجل کے عادی مال پرست لوگ ان بیانات کو حقیقت پر محمول کرنے کی پھر بھول کرنے لگے، سعودیہ وامارات کے حالیہ اقدامات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ایران کا کارڈ کھیل کر حجاز مقدس پر یہودی تسلط کی تیاری ہے، اب تک ایران کو خطرہ بتا کر اسرائیل سے دوستی کا جواز پیدا کیا گیا، کل ہی خبر آئی ہے کہ امریکی ایجنسی نے انکشاف کیا کہ حوثیوں کو جو میزائیل دیے گئے اور جن سے انھوں نے سعودیہ پر حملہ کیا وہ ایران کے فراہم کردہ تھے، اس وقت یہ خبر محض سعودیہ کے دفاع اور قضیہ فلسطین میں اس کے بدترین کردار سے توجہ ہٹانے کے لئے نیز اسرائیل سے دوستی کا جواز پیدا کرنے کے لئے عام کی گئی، حوثیوں کی مدد میں ایرانی کردار بہت واضح رہا ہے مگر سعودی اتحادی فوج نے بھی یمن میں حوثیوں کو نہیں مارا ہے بلکہ یمن میں سعودیہ کی ساری کارروائی اسلام پسندوں کو اقتدار سے دور رکھنے کے لیے ہی کی گئی اور بس، جزیرۃ العرب میں یہودی تہذیب کا تسلط تو پوری طرح ہو ہی چکا ہے، جو کچھ کسر رہ گئی تھی، سرپھرے شہزادے کے حالیہ فیصلوں سے وہ بھی پوری ہو جائے گی، معلوم نہیں کہ مملکت توحید کا نعرہ لگانے والے اور کتاب وسنت کی حکمرانی کا دم بھرنے والے اب ''سنیما گھروں'' کے قیام کو کس حدیث سے ثابت کریں گے۔

ہمیں ایران سے خطرہ ضرور ہے مگر اس خطرے کو ٹالنے کے لئے اسرائیل کی دوستی ہرگز منظور نہیں، ایران سے گفت وشنید اور

مسائل کا حل محال ومشکل ضرور ہے مگر ناممکن نہیں، مگر جن کی دشمنی کو قرآن سخت ترین دشمنی قرار دے ان سے دوستی رچانے کا کیا سوال؟ اسرائیلی وزیر خارجہ نے صاف بیان دیا کہ ''ہمارے بیشتر عرب ممالک سے گہرے تعلقات ہیں، مگر معاہدہ کے سبب ہم نام کا اظہار نہیں کر سکتے، اب تو اسرائیلی انٹلی جنیس کے سربراہ کا یہ بھی بیان آیا کہ ہم محمد بن سلمان کو تل ابیب آنے کی دعوت دیتے ہیں اور شاہ سلمان سے التماس کرتے ہیں کہ وہ بھی نیتن یاہو کو ریاض بلائیں۔

یہ غلط فہمی بھی دور ہونا چاہیے جو اس موقع پر پھیلانے کی کوشش کی گئی، جب اردوغان نے یہ سخت بیانات دیے، تو ۲۰۱۵ء کے ان کے دورہ اسرائیل کی ویڈیو وائرل کی گئی اور گویا یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی کہ یہ دوغلا پن ہے، بالکل اسی طرح جیسے بائیکاٹ کے جواز کے لیے قطر پر یہ الزام عائد کیا گیا تھا کہ اس کے ایران سے تعلقات بڑھ رہے ہیں، جبکہ واقعہ یہ ہے کہ ایران کی سب سے بڑی تجارت امارات سے ہے جس کے شواہد خوب موجود ہیں جس کا دل چاہے وہ ڈاٹا چیک کرلے، بلاشبہ اردوغان نے ۲۰۱۴ء میں اسرائیل سے سفارتی تعلقات بحال کیے، جو محض ڈپلومیسی کا حصہ ہے، لیکن ان سفارتی تعلقات کے سبب کبھی بھی ان کے موقف میں مداہنت و مجاملت نہیں دیکھی گئی جو سب سے اہم بات ہے، انہوں نے جس طرح حماس کو تعاون دیا، غزہ کو امداد فراہم کی، اخوان کے سلسلہ میں واضح موقف اختیار کیا، اسلامی تحریکات کی میزبانی اور نمائندہ اسلامی شخصیات کا دفاع کیا وہ ایسے وقت میں اپنی مثال آپ ہے جبکہ سعودیہ و امارات کی طرف سے اخوان وحماس جیسی تنظیموں کو دہشت گرد قرار دیا جا چکا ہے، بلکہ الاتحاد العالمی لعلماء المسلمین جیسی تنظیموں کو بھی اسی زمرے میں شمار کیا جا رہا ہے، آج بھی اسرائیل سے دشمنی کا ڈھونگ رچا کر بیت المقدس کا خفیہ سودا کرنے والوں کے مقابلہ میں کھلے عام سفارتی تعلقات رکھتے ہوئے جس طرح کا واضح موقف انھوں نے اختیار کیا ہے وہ ان کی شفافیت اور اسلامی سوچ کی واضح دلیل ہے، یورپ کے قلب میں واقع ترکی یعنی بتیس دانت کے درمیان تنہا زبان کے مانند اس گہوارۂ خلافت کا وجود وہ بھی اسلامی شناخت کے ساتھ باقی رکھنا کس قدر مشکل اور اہل یورپ کے لیے کس قدر گراں بارِ خاطر ہے یہ تبصرہ کرنے والے بے ضمیر قلمکار کیا جانیں۔

یروشلم کے متعلق یہ وہ فیصلہ ہے جس کی منظوری بعض محققین کے مطابق اکتوبر ۱۹۹۵ میں امریکی کانگریس دے چکی تھی لیکن کوئی امریکی صدر اس کے اعلان کی ہمت نہیں کر پا رہا تھا، اس معاندانہ اور عالمی قانون کی خلاف ورزی کرنے والے فیصلہ کے اعلان کے بعد اسلامی بلکہ پوری انسانی دنیا کے بیانات واحتجاج کے پیش نظر امریکہ نہ صرف بوکھلاہٹ کا شکار ہوا ہے اور بظاہر تنہا کھڑا نظر آ رہا ہے، بلکہ اس کے نائب صدر کے ہلکے پھلکے بیانات بھی آئے ہیں، لیکن یہ واضح رہنا چاہیے کہ یہ فیصلہ وعدہ بالفور کے ٹھیک سو سال بعد اُس وعدہ کی تکمیل کے طور پر آیا ہے، اس پورے عرصہ میں یہود نے ظلم کی جو داستانیں رقم کیں ان سے قطع نظر ان کی جہد مسلسل اور قوت عمل کو دیکھنا چاہیے، مرحلہ واریت کے ساتھ اس نے فسلطین میں دنیا بھر سے یہودیوں کو جمع کیا، رائے عامہ ہموار کی، عالمی طاقتوں کو اپنا ہمنوا بنایا، اس کی ریاست وجود میں آئی، اپنی مصنوعات، تخریبی کارروائیوں اور تجارتی ذہنیت کی مدد سے اس نے پوری دنیا کو اپنے شکنجہ میں کس لیا، پوری دنیا کی معیشت پر قابض ہو گیا، اس نے اعداد قوت کے جتنے ذرائع ہو سکتے تھے وہ سب اختیار کیا حتی کہ وہ ایٹمی طاقت بھی بن گیا، دنیا کی سپر پاور طاقت صہیونی لابی کی دست نگر ہو کر رہ گئی، جس قوم کی بابت قرآن نے یہ اعلان کیا تھا ضربت علیهم الذلة والمسكنة اين ما ثقفوا وہ اسی قرآن سے اس راز کو سمجھ کر جو الا بحبل من الله وحبل من الناس میں مضمر تھا، آج

دنیا کے مالک بن بیٹھے، اس کے بالمقابل مسلمان واعدوا لھم ما استطعتم من قوۃ کے حکم الٰہی کے باوجود اعدادقت سے غافل رہے، ان کی ساری تنظیمی قوت محض خاندانی اجارہ داریوں کی حفاظت کے لیے صرف ہوتی رہی، آج بھی سعودی شہزادوں کی گرفتاری و نظر بندی محض خاندانی حکومت کی اجارہ داری قائم رکھنے کے لئے عمل میں آئی، خبریں تو یہاں تک ہیں کہ ان شہزادوں کی مرمت کے لئے بدنام زمانہ امریکی ایجنسی ''بلیک واٹر'' کو کنٹریکٹ دیا گیا ہے، صنعتی دنیا میں بھی مسلمان پیچھے رہے، ان کی دولت محض عیش وعشرت کے سامان فراہم کرنے کے لئے استعمال ہوتی رہی، جبکہ اغیار ان ہی کی معدنیات سے دنیا پر غلبہ کا سامان تیار کرتے ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج پوری ملت اسلامیہ غلام بن کر رہ گئی۔

کتاب الفتن کی روشنی میں یہ کہنا کہ یہودی اپنی قتل گاہ میں جمع ہو رہے ہیں، بجا ہے، مگر اس سے قبل وہ قتل عام کریں گے، یہ بھی ہے، بہر حال وہ جمع ہوں اور ہم نزول مہدی کے منتظر رہیں یہ اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے، عربوں نے جو کچھ کیا اور جو کچھ کر رہے ہیں وہ سامنے ہے، فی الوقت کیا ہونے والا ہے اس بارے میں کچھ کہنا قبل از وقت ہوگا، البتہ ہم کیا کر سکتے ہیں یہ سوال اہم ہے، ہم پہلے بھی اس سے متعلق کبھی اظہار خیال کر چکے ہیں، محض مذمتی بیانات جاری کرنا، قراردادیں پاس کرنا اور بائیکاٹ کی اپیلیں کرنے سے کچھ نہیں حاصل ہوگا، سالہا سال سے مسلم سربراہان اور OIC نے اس کے علاوہ اور کیا کیا ہے۔

یقیناً ہم دعائیں کر سکتے ہیں تو ہمیں کرنا چاہیے، ہمیں ہر ہر فرد کو مسجد اقصیٰ کے مقدمہ سے واقف کرانا چاہیے، ہمیں اس کو پوری انسانیت کے مقدمہ کے طور پر منصف مزاج برادران وطن تک پہنچانا چاہیے، ہمیں اسرائیل کی مصنوعات کا بائیکاٹ کرنا چاہیے مگر اس کی مصنوعات کا بائیکاٹ کرنے کے لئے متبادل بھی پیش کرنا چاہیے، اہل ثروت اور تجار کو اس کے لیے تیار کرنا چاہیے کہ وہ سامان کی خرید فروخت کے مرحلہ سے نکل کر صنعتی دنیا میں قدم جمائیں اور ملت وافراد ملت کی کفالت کا ذریعہ بنیں، ایک آدھ کمپنیاں اس جذبہ سے آئیں بھی تو خالص دیندار طبقہ بھی ان کا ساتھ نہ دے سکا، اپنی پسند کو چھوڑنے اور کسی چیز کا مقاطعہ کرنے کے لیے وہ جذبہ چاہیے جو ڈاکٹر حمید اللہؒ میں تھا، ان کی زندگی پیرس میں گذری، وہ مشین کے ذبیحہ کو حلال نہیں سمجھتے تھے اس لیے گوشت نہیں کھاتے تھے، بعض لوگوں نے کہا کہ اہل کتاب کا ذبیحہ حلال ہے اور یہاں یہود کی دکانیں ہیں آپ ان سے گوشت لے لیا کریں، تو فرمایا کہ میں نہیں چاہتا کہ میرے گوشت کھانے کی قیمت فلسطینیوں کا خون بہانے میں استعمال ہو، اس لیے کہ دنیا کا ہر یہودی اپنی آمدنی کا کچھ فیصد اسرائیل کے استحکام کے لیے صرف کرتا ہے، چنانچہ ڈاکٹر حمید اللہ نے پوری زندگی گوشت نہیں کھایا، اس کی جگہ وہ وہاں پنیر کا استعمال کیا کرتے تھے، مگر جب سے ان کو یہ علم ہوا کہ پنیر بنانے میں وہاں ایسی چربی کا استعمال ہوتا ہے جو حلال نہیں تو اسے بھی ترک کر دیا۔

اس واقعہ میں جہاں ڈاکٹر مرحوم کا جذبہ قابل تقلید ہے وہیں کا انداز فکر وعمل کس قدر قابل غور اور لائق عمل ہے کہ پوری دنیا اور لائق عمل ہے کہ پوری دنیا کے یہودی انفرادی کوششوں کا کچھ حصہ ایک اجتماعی ہدف اور اجتماعی کاز کے لیے ضرور نکالتے ہیں، اس طرح وہ منفرد رہ کر بھی اجتماعیت کے لئے کام کرتے ہیں، دور رہ کر بھی قریب رہتے ہیں، ایسے ہی جذبہ کے ساتھ یہ وقت ہے اقدامات وعمل کا، سخت فیصلے لینے کا، لوگوں کو ان شاہوں کی اصلی صورت دکھانے کا جو بیت المقدس کے بدلہ حضرت عیسیٰؑ کی ایک پینٹنگ کو اربوں روپیے میں خریدتے ہیں، یہ وقت ہے قضیہ فلسطین کو عنوان بنا کر امت کو متحد کرنے کا اور امت کی فلاح کے لیے منظم فیصلے کرنے کا، یاد

رکھنا چاہیے کہ حرمین کی حفاظت کا ذمہ یقیناً اللہ تعالیٰ نے لیا ہے، لیکن مسجد اقصیٰ کو اس امت کی ذلت وعظمت اور عروج وزوال کی علامت بنا دیا ہے، چنانچہ جب جب بیت المقدس مسلمانوں کے قبضہ میں رہا یہ امت سر بلند رہی اور جب بھی بیت المقدس غیروں کے زیر نگیں رہا یہ امت پست وذلیل اور رو بہ زوال رہی، قرآن مجید کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مسجد اقصیٰ کا راست علق مسلمانوں کی ایمانی اور عملی کیفیت سے ہے، اس کی بازیابی کے لئے مسلمانوں کو بہر حال رجوع الی اللہ کرنا پڑے گا اور گناہوں سے توبہ کرنا ہوگا ورنہ اگر مسجد اقصیٰ چلی گئی تو پھر اس امت کو پستی سے کوئی نہیں نکال سکتا۔

....

وطن کی فکر کر ناداں!

ہمارا ملک اس وقت فرقہ پرستی، انارکی اور فسطائی رنگ میں رنگا جا رہا ہے، ملک کی نئی کرنسی میں بھی ایک نوٹ بھگوا رنگ کا آ گیا ہے، آئے دن بھیڑ کے ذریعہ قتل کے واقعات ہو رہے ہیں، ابھی اودے پورے میں شمبھوناتھ ریگر نے جس بہیمانہ انداز سے ایک غریب مسلمان مزدور کو لے جا کر تڑپا تڑپا کر مارا اور پھر اس کو زندہ جلا دیا، پھر خود ہی ہندتو کے فروغ کے لیے ویڈیو بنا کر وائرل کی، یقیناً یہ سب اس ملک کی سالمیت کے لیے خطرہ کی گھنٹی ہے، اس ملک کی گنگا جمنی تہذیب ہی نہیں بلکہ انسانیت کے لیے خطرہ کی گھنٹی ہے، اس سے زیادہ خطرناک واقعہ اس بھیانک اور دلدوز واردات کو انجام دینے کے بعد یہ انجام پایا کہ شمبھوناتھ کے سپورٹ میں ہزاروں سنگھی دیوانے نکل آئے، عدالت پر بھگوا جھنڈا اتنک لہرا دیا، پولیس کی جان پر بن آئی تو اس کو اپنے طریقہ سے نمٹنا بھی پڑا۔

ملک کے حالات دن بہ دن معاشی، سیاسی اور سماجی اعتبار سے ابتری کی طرف بڑھتے جا رہے ہیں، ایک ایک کر کے تمام صوبے بھگوا بریگیڈ فتح کرتا جا رہا ہے، پھر اس کے بعد کیا ہوگا اس کہانی کو دہرانے سے کیا فائدہ جسے ہم کئی بار لکھ چکے ہیں اور جس کا کوئی نتیجہ بھی ہمیں دیکھنے کو نہیں ملا۔

گجرات اور ہماچل کی فتح کے بعد ملک کے ٦٨ فیصد حصے پر بھگوا بریگیڈ کی حکمرانی قائم ہے، ۲۰۱۸ء میں ۸ صوبوں میں انتخابات ہیں، جبکہ ۲۰۱۹ء میں عام انتخابات ہیں، اپنی تمام تر ناکامیوں اور عوام کو ہو رہی تمام تر پریشانیوں کے باوجود بھاجپا کی فتح ورفتح ہم کو سوچنے پر مجبور کرتی ہے، سورت شہر کے تاجروں نے جی ایس ٹی کی سب سے زیادہ مخالفت کی تھی اور بی جے پی نے خاص طور پر سورت اور راجکوٹ کی اسمبلی سیٹوں پر کامیابی حاصل کر کے جی ایس ٹی پر مہر تایید لگوالی، گجرات الیکشن پر آپ کو بہت سارے تجزیے پڑھنے کو ملیں گے اور آپ پڑھتے رہیے، مگر اتنا یاد رکھیے کہ اس الیکشن سے جہاں امید کی کرنیں نظر آئی ہیں، وہیں یہ بھی بہت واضح ہو گیا ہے کہ اب بی جے پی کو روکنا اس قدر آسان نہیں، اگر ای وی ایم کو بالکل درست مانا جائے تو انتخابات مہم کے دوران بی جے پی کو جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اس کے بعد اچانک یہ جیت صرف الیکشن کو ایک آدھ بیانات سے ہندو مسلم بنا دینے کا نتیجہ ہے، اگرچہ ہمارا یہ ماننا ہے کہ ای وی ایم کی کارکردگی مکمل طور پر قابل اطمینان نہیں ہے، جس کے بیشتر ثبوت موجود ہیں، سورت وراجکوٹ کی سیٹوں پر بھاجپا کی کامیابی بہت واضح دلیل ہے، جس پر ہاردک پٹیل نے جو سوال اٹھایا مودی نے اپنے بیان میں اس سوال کا ایسا جواب دیا جس

سے سوال صحیح ثابت ہوگیا، اب اگر تمام پارٹیاں ای وی ایم کے خلاف آندولن نہیں کرتی ہیں، بالخصوص کانگریس تو اس کا مطلب کہ وہ آر ایس ایس کے ایجنڈے میں شرک ہیں، کانگریس کی شناخت سیکولر پارٹی کی ہے اگر چہ یہ بات اب تک ہم نہیں تسلیم کر پائے، گجرات میں بھی کانگریس نے سخت گیر ہندتو وادی جماعت کے بالمقابل ہندوتو کے اظہار کا نرم طریقہ اپنایا جو بہر حال قابل تشویش ہے، اگر سب اپنی اپنی کتھا گاتے اور نعرے لگاتے رہے، گوشۂ عافیت میں بیٹھے رہے اور چھوٹی چھوٹی انسانی خدمات کے ذریعہ انقلاب کا خواب دیکھتے رہے تو وہ دن دور نہیں جب پارلیمنٹ میں اپوزیشن کا نام ونشان تک نہ ہوگا، کانگریس مکت بھارت'' کی تکمیل کے بعد ''مسلم مکت بھارت'' کے ایجنڈے پر عمل ہوگا جس کا نعرہ بلند کیا جاتا رہا ہے اور جس کی عملی تصویر یہ ہے کہ اس ملک میں اپنے آپ کو کنگ میکر (King Maker) کہنے والے مسلمانوں کے ووٹ کو بالکل بے حیثیت وبے اثر کردیا گیا ہے، لوگ گجرات الیکشن میں کانگریس کی کامیابی کو اس کی واپسی اور بی جے پی کی شکست مانتے ہیں اور ہم اسے بی جے پی کی چالا کی تسلیم کررہے ہیں، یوپی میں یک طرفہ جیت نے جو سوالات کھڑے کیے اس کے پیش نظر گجرات میں یہ کام ممکن نہ تھا، اس کم فاصلاتی جیت نے ۲۰۱۸ اور ۲۰۱۹ میں بھاجپائی جیت کس قدر آسان کردی ہے یہ وقت بتائے گا۔

ہمارے لیے سوچنے کی بات یہ ہے کہ بھاجپا اس قدر طاقت ور کیسے ہوئی، آر ایس ایس نے اتنے طویل عرصہ میں کسی طرح محنت کی، کس کس شعبہ میں کارکردگی دکھائی، کس طرح زمینی کام کیا، کس طرح اپنے پاؤں مضبوط کیے، کیا آر ایس ایس کے مقابلہ ہم اپنا کوئی بھی کام پیش کرسکتے ہیں، جو اس کی طرح منظّم ہو اور جس کے نتائج سو فیصد نظر آتے ہوں، کیا ہماری ہزاروں تنظیموں میں سے کوئی ایک تنظیم بھی اس کا دعوی کرسکتی ہے کہ وہ مدمقابل کی طرح منظّم ہے اور قوم کے استحکام کے لیے مختلف میدانوں میں کام کررہی ہے، افسوس ہے کہ ایک طرف صورت حال یہاں تک آپہنچی کہ کھلے عام قاتل کی طرفداری کی جارہی ہے، عدالت پر ناز تھا تو اس پر بھی بھگوا جھنڈا لہرادیا گیا، دوسری طرف ابھی بھی یہ بحثیں جاری ہیں، جدید پڑھا جائے یا قدیم، ملا کو قائد مانا جائے یا مسٹر کو، اسکول بنایا جائے یا مدرسہ، سیاست میں حصہ لیا جائے یا خاموش تماشائی رہا جائے، فلاں سے ملا جائے یا نہیں ملا جائے، کیا بیس کروڑ کی آبادی والے اس ملک میں کوئی تنظیم اور کوئی ادارہ اس کا دعوی کرسکتا ہے کہ اس کے پاس اس ملک کے مسلمانوں کے مسائل حل کرنے کا منظّم ایکشن پلان ہے، کیا ان بیس کروڑ مسلمانوں کے پاس کوئی تھنک ٹینک ہے، جو مسائل کی شناخت کرے، ان کی تحقیق کرے، ان کا حل پیش کرے، ان کو سرکاری سطح پر اٹھائے، ظاہر ہے ان سب اعتبارات سے اس ملک کے مسلمان یتیم ہیں، نہ منزل کا پتہ ہے نہ سمت سفر کا تعین، بس مسافر کی طرح ٹولیوں میں بٹے ہوئے جس کا جدھر دل چاہے چلا جارہا ہے، جس کو جو کچھ سمجھ میں آجائے وہ اسی کی افادیت بیان کرنے اور اسی کام کی توسیع واشاعت میں مست ومگن ہے۔ ہر فرد اس ملک میں ادارہ ہے، اور ہر ادارے کا الگ نعرہ ہے اور یہ نعرہ ہی فی الوقت ملت کے مقدر کا کھوکھلا سہارا ہے۔

ملکی سطح پر تقویت وتبدیلی کا عمل کہاں سے شروع ہوگا اور کہاں سے گزرے گا اور کب انجام کو پہنچے گا اس کی کسی کو خبر نہیں، آپس میں کوئی تعاون نہیں، ملکی اور قومی سطح کا کوئی ایکشن پلان نہیں، جن پہ تکیہ تھا ان پتوں نے ہمیشہ ہوا دی مگر پھر بھی احتساب کا کسی کو خیال نہ آیا، اب جبکہ وہ طاقتیں بھی بے بس ہوگئیں تو سب بوکھلائے ہوئے ادھر ادھر بھاگ رہے ہیں، آزادی کے بعد سے ملک کی مسلم

قیادت نے سب سے بڑی غلطی یہ کی اپنے آپ کو یکسر سیاست سے الگ کیا اور نیم سیاسی عمل کے ذریعہ کانگریس کا دامن تھام لیا، اسی اثناء میں آر ایس ایس کا بیج پنپتا رہا حتی کہ تن آور درخت بن کر برگ وبار لے آیا، بھاجپا میدان میں آئی اور اقتدار تک پہنچی، لیکن اس مرحلہ تک پہنچتے پہنچتے ہماری قیادت اس قدر کمزور ہوچکی تھی کہ وہ کانگریس کو احتساب پر بھی نہ مجبور کرسکی کہ آخر یہ سب کیوں ہوا، تیسرا محاذ کیوں بنا، پھر بھاجپا کیوں آئی، اور کانگریس کو بالکل ہی شکست فاش کیوں ملی، آخر کیا وجہ ہوئی کہ عام طور پر لوگ گانگریس اور بھاجپا کو ایک ہی سکے کے دورخ کہنے لگے، کیا وجہ ہے کہ کانگریس اپنے طویل دور اقتدار میں آر ایس ایس کو پابند سلاسل نہ کرسکی، اس کو ممنوعہ تنظیم بھی قرار نہ دے سکی، کانگریس اگر سیکولرزم کی حامل تھی تو اس نے اس طرح کا طویل دور اقتدار پایا جس طرح کا اب بھگوا جماعت کو ملا تو پھر آر ایس ایس پر پابندی وہ کیوں نہ لگا سکی، صوبائی سطح پر ہماری قیادتیں علاقائی پارٹیوں کے چکر کاٹتی رہیں اور آشرواد دینے میں ہی مطمئن رہیں، نتیجہ یہ نکلا کہ آج سب کو اپنا وجود ہی بوجھ لگنے لگا،

کتنا افسوس ہوتا ہے اور کبھی اپنی بے بسی پر ہنسی بھی آتی ہے کہ ایسے وقت میں جب کوئی سننے کو تیار نہیں، جب یہ نعرے لگائے جارہے ہیں کہ ''ہندوستان میں رہنا ہوگا تو وندے ماترم کہنا ہوگا''، ''ہندوستان میں رہنا ہوگا تو بھارت ماتا کی جے بولنا ہوگا''، وغیرہ، تب ہم محض کھوکھلے نعرے لگاتے ہیں، ہر مہینے جلسے جلوسوں میں قومی دولت برباد کرتے ہیں اور شخصیتوں کے نعرے بلند کرتے ہیں، حکومت سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ فرقہ پرستی چھوڑ دے، حق دے، انصاف کرے، عین جس وقت ہم یہ سب کچھ کررہے ہوتے ہیں اسی وقت وہ سب کچھ ہوتا ہے، جس کے خلاف ہم مظاہرہ کررہے ہوتے ہیں اور مطالبات دوہرارہے ہوتے ہیں، کبھی سوچنے کی توفیق نہیں ہوتی کہ آخر ایسا کیوں ہوا اور آگے کیا ہونے والا ہے، اس پر طرفہ تماشا یہ کہ ہم چیخ چیخ کر یہ بھی کہتے ہیں کہ ہندوستان کو برما نہیں بننے دیں گے، ہم کو روہنگیا مسلمانوں جیسی سزا دینے کی کوشش نہ کی جائے، گویا ہم یہ بتاتے ہیں کہ ہمارے حاشیہ خیال اور گوشہ ذہن میں ایسا واقعہ پیش آنے کا خدشہ موجود ہے، اگر اس صورت حال اور طرز سخن وطرز عمل پر ماتم نہ کیا جائے تو اور کیا کیا جائے کیوں کہ اس تو ہم پرست اور عقیدت کے سہارے چلنے والے ملک میں پریشانی یہ ہے کہ عقیدت کے آگے ساری فکریں مات کھا جاتی ہیں۔

لیکن حالات یہ کہتے ہیں کہ اب اس طرز فکر کو بدلنے کی ضرورت ہے، اب ایک متحدہ لائحہ عمل بنانے کی ضرورت ہے، جو لوگ وسائل پر قابض ہیں مگر اپنی محدود فکر یا یا مصلحت پسندی کے سبب کچھ کرنے سے کتراتے ہیں انہیں چاہیے کہ اب وہ دوسروں کو موقع دیں، نئی نسل کو تیار کریں، سب سے بنیادی کام یہ ہے کہ اس ملک میں اپنی شخصیت، صحیح تاریخ اور اپنے دین کو متعارف کرانے کی بھرپور تحریک چھیڑیں، اس کے لیے سماجی اور معاشی تعلقات کو فروغ دیں، جب سماج میں فاصلے کم ہوں گے، معاشی رشتے استوار ہوں گے تو قربت بڑھے گی، اس قربت کے ذریعہ اپنے تعارف کا زریں موقع ہاتھ آئے گا جو سوچ کو بدلنے میں کامیاب ومعاون ہوگا، اب گوشہ عافیت سے نکلنے کی ضرورت ہے، اپنے حلقوں سے نکل کر غیروں کے درمیان سماجی اور انسانی مسائل کو بنیاد بنا کر گفتگو کرنے کی ضرورت ہے، مگر یہ کام اگر دفاعی انداز اور غیر منظّم طریقہ نیز بغیر کسی دوررس لائحہ عمل اور متعین ہدف کے کیا گیا تو نتیجہ صرف یہ ہوگا کہ لوگ آئیں گے، کھائیں گے اپنا کام نکالیں، اور چلتے بنیں گے، اتنے بڑے ملک میں اگر دو چار مثبت واقعات پیش آئیں تو وہ تجزیہ کی بنیاد نہیں قرار پاسکتے، تجزیہ بڑے سروے اور سامنے کے مشاہدات پر ہی مبنی ہوگا اور بالخصوص اس طبقہ کے حالات پر مبنی ہوگا اور بالخصوص اس طبقہ کے

حالات پر مبنی ہوگا جو صورت حال کو ہر طرح بدلنے کی اہلیت صلاحیت رکھتے ہیں تو اس تجزیہ کا خاطر خواہ فائدہ ہوگا۔

ہم کو سب سے پہلے اور سب سے اہم یہ کام کرنے کی ضرورت ہے کہ ہماری تمام ملی سطح کی تنظیمیں سر جوڑ کر بیٹھیں، ایک متحدہ لائحہ عمل تیار کریں، اپنے اپنے کاموں کو تقسیم کریں اور ایک با مقصد ہدف کے لئے سب باہمی تعاون کے جذبہ سے متحدہ اور منظم لائحہ عمل کو نتیجہ خیز بنانے کے لیے کام کریں، اگر اب بھی یہ انتشار کی کیفیت ختم نہ ہوئی اور سب الگ الگ نعرے لگاتے رہے اور شخصی توسیع پسندی کی تحریک میں ہی مگن رہے تو پھر واقعہ یہ ہے کہ مقررین و مفکرین جن خطرات کا اظہار اپنی تقریروں اور تحریروں میں کرتے ہیں وہ سب ایک ایک کرکے ظاہر ہوتے جائیں گے، عالمی منظر نامہ اس کا گواہ ہے، ہندوستانی سیاست کے بگڑتے تیور اور غالب ہوتی ہوئی فسطائی ذہنیت اس کے لیے زمین تیار کررہی ہے، وقت کے انگڑائی لینے سے پہلے چھوٹی چھوٹی ٹھوکروں سے عبرت حاصل کرتے ہوئے ایک متحدہ تھنک ٹینک کا قیام لازمی ہے، ہمارے یہاں ہر شخص کے ایک ادارہ ہونے کی عادت کو ختم کرنا ضروری ہے، منتشر نعروں کو ختم کرکے ایک طاقتور نعرہ لگانے کی ضرورت ہے، یہ تب ہی ممکن ہے جب ملی اور دینی مفاد کے لئے سب اپنے اپنے بینر کو جلا کر میدان عمل میں اتر آئیں اور انفرادی کاموں کو اجتماعی ہدف کے حصول کا ذریعہ بنائیں، سماجی خدمات کو نچلی سطح سے سیاست میں داخلہ کا وسیلہ بنائیں، بنیادی تعلیم کو جہالت دور کرنے کا طریقہ بنائیں، معاشی تعلقات کو قربت میں بدلیں اور اس پر آمادہ ہوجائیں کہ ہمارا ہر کام ملت کی بقا ہی نہیں ملت کی سر بلندی کے لیے ہے، بقول مفکر اسلام مولانا علی میاںؒ ''علماء و دانشوروں کا یہ فریضہ ہے کہ اسلام کے مفاد کو ہر جماعت، ہر ادارہ، ہر مدرسہ اور ہر گروہ کے مفاد پر ترجیح دیں، میں آپ سے صاف کہتا ہوں کہ اگر ہمیں معلوم ہو کہ سب جماعتوں کو مٹا دینا پڑے گا، سارے ناموں کو ختم کردینا پڑے گا، سارے بورڈوں کو ہٹا دینا پڑے گا اور اسلام اس ملک میں غالب رہے گا تو ہمیں ایک منٹ بھی اس میں پس و پیش نہیں ہونا چاہیے، ہمیں دین و ملت کا مفاد ہر جماعت سے عزیز ہونا چاہیے، اس کا سہرہ چاہے کسی کے سر بندھے، حضورﷺ کا معجزہ تھا کہ صحابہ کرام کے دل سے یہ شوق نکل گیا تھا کہ ان کا کارنامہ سمجھا جائے......'' (ندوۃ العلماء کا فکری و ملی شعور، ص ٦-٧)

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

❑ پیامِ سیرت

تندیٔ بادِ مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب!

محمد فرید حبیب ندوی
12fareedamu@gmail.com

''یہ تم نے کونسا نیا دین ایجاد کررکھا ہے...... جو سب سے الگ ہے؟''

شاہی دربار سجا تھا...... بادشاہ پورے شاہی طمطراق کے ساتھ جلوہ افروز تھا...... حواشی موالی اپنی اپنی جگہ تعینات تھے...... گارڈز ننگی تلواریں ہاتھوں میں لئے چوکس کھڑے تھے۔

بادشاہ کی نگاہ ان چودہ پندرہ معصوم صورت لوگوں پر ٹکی تھی...... جن کا مقدمہ اس کے دربار میں پیش کیا گیا تھا۔

ان کی شکلیں بتارہی تھیں کہ وہ پردیسی ہیں...... چہرے پژمردہ...... حلیہ بوسیدہ...... نگاہیں مضطرب...... دل پریشاں۔

آہ!...... کتنے بے بس تھے وہ؟

اجنبی ملک میں ...... بے گانے لوگوں میں...... جہاں اپنا کوئی نہ تھا۔

انھیں دیکھ کر ہی ترس آتا تھا۔

وہ ڈرے سہمے کھڑے تھے...... دربار کا ایک ایک فرد ان کے خلاف تھا۔

ان کی فردِ جرم بھی عجیب تھی...... نہ وہ چور تھے...... نہ قاتل...... نہ انھوں نے کسی پر ظلم کیا تھا...... اور...... نہ کسی کو مار کے بھاگے تھے...... ان کا جرم بس یہ تھا کہ انھوں نے تاریک رات میں روشنی جلانے کا عزم کیا تھا۔

وہ بیاباں کی شب تاریک میں قندیل رہبانی کا حوصلہ لے کر اٹھے تھے۔

دربار میں سناٹا تھا...... سب کی نگاہیں یا بادشاہ کے رعب دار چہرے پہ تھیں...... یا...... ان معصوم جھکے سروں پر۔

بادشاہ کے اس جملے نے محفل کے سکوت کو توڑا۔

دل کی دھڑکنیں تیز ہوگئیں...... سانس کی رفتار بڑھ گئی...... جھکی نظریں اٹھیں اور ایک بار پھر جھک گئیں۔

''ہاں...... بتاؤ...... یہ کیا طریقہ تم نے اختیار کررکھا ہے؟''

''یہ طریقہ ہمیں محمد (ﷺ) نے سکھایا ہے''۔

سہمے ہوئے قیدیوں میں سے ایک نے آگے بڑھ کر کہا۔

''یہ محمد (ﷺ) کون ہیں؟''

بادشاہ نے پھر سوال داغا۔

''یہ ہمارے بھائی بندوں میں سے ہی ایک ہیں...... اللہ تعالی نے انھیں اپنا رسول بنا کر بھیجا ہے...... یہ وہی پیغام لے کر آئے ہیں جو یسوع مسیح لے کر آئے تھے''۔

''یسوع مسیح؟...... تمھیں یہ نام کس نے بتایا؟''

''محمد (ﷺ) نے''۔

''وہ کیا پیغام لے کر آئے ہیں؟...... ذرا تفصیل سے بتاؤ''۔

''وہ ہمیں ایک خدا کی پرستش کا حکم دیتے ہیں...... اس کے

ساتھ شرک کرنے سے روکتے ہیں...... بادشاہ سلامت! ہم تو جاہل اور گنوار تھے......مردار کھاتے اور گندے کام کرتے......ایک دوسرے کا خون پیتے ...... کمزوروں پر ظلم کرتے......لڑکیوں کو زندہ درگور کردیتے......سود کھاتے......رشوت لیتے......پڑوسیوں کا کوئی خیال نہ کرتے......ذراذراسی باتوں پر ایک دوسرے کا خون بہادیتے......غرض ہم انسان کیا، حیوان تھے......اللہ تعالی کو ہم پر رحم آیا......اس نے ہمیں میں سے ایک رسول بھیجا...... جسے ہم اچھی طرح جانتے پہچانتے ہیں......اس کا بچپن اور جوانی ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے......وہ سچا ہے......اور ہمیں سچائی کا حکم دیتا ہے......اس نے ہمیں امانت داری، صلہ رحمی، غم گساری، اور اچھی باتوں کا حکم دیا...... ہم اس پر ایمان لے آئے ......اور اس کو رسول مان لیا......پھر کیا تھا، ہماری قوم ہماری دشمن ہوگئی ......اس نے ہماراجینا دوبھر کردیا، تو محمدﷺ نے ہمیں حکم دیا کہ ہم آپ کے ملک میں پناہ لیں......کیونکہ آپ ایک رحم دل اور انصاف پسند انسان ہیں''۔

''اوہ!......اچھا......وہ اتنی اچھی باتیں بتاتے ہیں...... یہ تو وہی کلام لگتا ہے جو عیسی لے کر آئے تھے......تمھارے پاس ان کا لایا ہوا پیغام موجود ہے؟''۔

''جی ہاں''۔

''ذرا سناؤ تو''۔

اسی شخص نے محمد (ﷺ) کے لائے ہوئے پیغام کا کچھ حصہ سنایا۔

نہ جانے اس میں کیا بات تھی کہ سب رونے لگے......اتنا روئے ،اتنا روئے کہ ان کی داڑھیاں تر ہوگئیں......ایسا پرتاثیر کلام انھوں نے پہلی بار سنا تھا۔

''تم جاؤ......آرام سے رہو......میرے ملک میں تمھیں ہر طرح کی امان ہے''۔

بادشاہ نے ان کے حق میں فیصلہ سنا کر انھیں پورے اعزاز کے ساتھ رخصت کیا۔

''بادشاہ سلامت! یہ لوگ عیسی مسیح کے بارے میں غلط سلط باتیں کہتے ہیں''۔

اگلے دن دشمن نے پھر شوشہ چھوڑا۔

''تم لوگ عیسی مسیح کے بارے میں کیا عقیدہ رکھتے ہو؟''۔

بادشاہ نے انھیں بلوا کر پوچھا۔

وہ اس دوبارہ طلبی سے کچھ پریشان ہوئے......کئی سارے اندیشے ذہن میں آنے لگے۔

کہیں بادشاہ نے اپنا ارادہ تبدیل تو نہیں کردیا......کہیں وہ ہمیں دشمن کے حوالے تو نہیں کردے گا......اب کیا بات ہے...... دوبارہ کیوں بلایا ہے؟

''ہم عیسی مسیح کے بارے میں وہی کہتے ہیں جو ہمارے نبی نے ہم کو بتایا ہے''۔

اس نے بلاخوف وتردد سچ بات کہی۔

''کیا بتایا ہے تمھارے نبی نے تمھیں؟''۔

''انھوں نے بتایا ہے کہ عیسی مسیح اللہ کا کلمہ اور اس کی روح ہیں، جو اس نے کنواری مریم کی طرف القا کیا''۔

ڈرے سہمے ماحول میں اس نے بے لاگ تبصرہ سنایا۔

''بخدا! جو کچھ تم نے کہا، عیسی مسیح اور تمھاری بات میں اِس تنکے کے برابر بھی فرق نہیں''۔

بادشاہ نے ایک تنکا اٹھا کر اس کی تائید وتحسین کی۔

دشمن آخری حربہ بھی استعمال کر چکا تھا......مگر اس بار بھی ناکامی اس کا مقدر بنی۔

یہ واقعہ جو آپ نے پڑھا، مسلمانوں کی ہجرت حبشہ کا واقعہ ہے...... جب مکہ میں ان پر ظلم وستم کیا گیا، تو وہ ہجرت کر کے حبشہ چلے گئے...... دشمنوں نے یہاں بھی اپنے نمائندے بھیج کر شاہ حبشہ کو ورغلانا چاہا...... مگر وہ نہایت منصف اور سمجھ دار تھا...... وہ اُن کی چالوں کو سمجھ گیا...... اور اس نے مسلمانوں کو ان کے حوالے کرنے سے انکار کردیا۔

یہ واقعہ اسلام کی غربت واجنبیت کی مثال ہے۔

ذرا آپ اس وقت کا تصور کیجیے...... جب مسلمان گنے چنے تھے...... پوری دنیا میں کوئی ان کا ہمدرد نہ تھا...... کوئی ان کے ساتھ نہ تھا...... کس طرح بچتے بچاتے وہ حبشہ پہنچے ہوں گے...... اور پھر جب انھیں عدالت میں طلب کیا گیا ہوگا، تو کتنے اندیشہائے دور دراز ان کے ذہن میں آئے ہوں گے...... چند پاکیزہ نفوس کس بے بسی اور کسمپرسی سے گذرے ہوں گے!!

اُس زمانے کا تصور کرتا ہوں تو اُن لوگوں کی عظمت کے سامنے سرخم ہوجاتا ہے...... نگاہیں جھک جاتی ہیں...... دل ان کی محبت سے مچلنے لگتا ہے...... بے اختیار آنسو نکل پڑتے ہیں...... بے چارے کس طرح چھپ چھپاتے اپنے دین کو بچا رہے تھے...... کیسی کیسی دشواریوں سے گذر رہے تھے...... جہاں پناہ کی امید میں گئے...... وہاں بھی جب دشمن پہنچ گیا...... تو دل پر کیا بیتی ہوگی...... کس طرح زمین پاؤں کے نیچے سے کھسکتی محسوس ہوئی ہوگی!!

یہ واقعہ موجودہ حالات میں ہمیں کئی سبق دیتا ہے:

آج بھی مسلمان اس ملک میں اجنبیوں کی حیثیت میں ہیں...... بے یقینی اور اندیشوں میں گرفتار ہیں۔

ان حالات میں مسلمانوں کو وہی کرنا چاہیے جو مہاجرین حبشہ نے اُس وقت کیا۔

وقت کتنا ہی سخت ہو...... حالات کیسے ہی ناموافق ہوں...... ہوا کو تند وتیز ہو...... مگر...... مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اپنے مذہب، اپنے عقائد اور اپنے تشخصات کا سودا نہ کریں...... وہ کسی بھی حال میں محبت رسول اور اتباع اسلام سے پیچھے نہ ہٹیں...... مضبوطی اور یقین کے ساتھ اپنے عقائد پر جمے رہیں۔

ان کی کامیابی اسلامی عقائد پر جمنے میں ہے، نہ کہ اس میں نرم رویہ اپنانے میں۔

ان حالات میں اسلام کا پیغام دوسروں تک پہنچائیں، جیسے شاہ حبشہ کے دربار میں مسلمانوں نے کیا۔

دعوت اور تبلیغ ان کی کامیابی کی شاہ کلید ہے...... اس کے بغیر کامیابی کا تصور محال ہے۔

تیسری اہم بات یہ ہے کہ اس وقت دشمنوں نے برادران وطن کے ذہنوں میں اُن کے بارے میں شدید بدگمانیاں پیدا کردی ہیں...... انھیں یہ باور کرادیا گیا ہے کہ مسلمان تمھارے دشمن ہیں...... اور طرح طرح سے ان کے مذہبی جذبات برانگیختہ کئے جارہے ہیں۔

یہ بالکل وہی کام ہے جو نجاشی کے دربار میں مشرکین کے نمائندوں نے کیا تھا...... اور بادشاہ اور اس کے درباریوں کے مذہبی جذبات ابھارنے کی کوشش کی تھی۔

مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ غیر مسلم عوام وخواص کا ذہن صاف کریں...... جیسے مہاجرین حبشہ نے نجاشی کا ذہن صاف کیا تھا...... اور برادران وطن کو یہ یقین دلائیں کہ ہم تمھارے خیر خواہ ہیں، دشمن نہیں،...... ہم تو انسانیت کے محافظ اور محبت کے علم بردار ہیں۔

☆☆☆

پس منظر

عہد حاضر کا سانحہ کربلا

پروفیسر محسن عثمانی ندوی

اسلام کے نظام سیاست وحکومت کے موضوع پر عربی زبان میں علماء قدیم نے بہت سی کتابیں لکھی ہیں، آج بھی وہ کتابیں اسلامی فقہ کے حوالہ کی کتابیں سمجھی جاتی ہیں ۔علامہ ماوردی کی کتاب الاحکام السلطانیہ اس موضوع پر اہم مرجع ہے، امام ابن تیمیہ کی کتاب بھی اس موضوع پر ہے جس کا نام ہے الامامہ والسیاسۃ ، امام ابو یوسف کی کتاب '' کتاب الخراج'' اسی موضوع پر ہے ۔ موجودہ دور میں عربی زبان میں سیاست اور حکومت پر بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں علامہ یوسف القرضاوی کی فقہ الدولۃ اور فقہ الجہاد کا تعلق اسی موسوع سے ہے، اردو زبان میں اس موضوع پر بہت زیادہ کتابیں نہیں ملتی ہے پچاس سال پہلے دار المصنفین سے ایک کتاب اسی موضوع پر شائع ہوئی تھی جس کا نام ''اسلام کا سیاسی نظام'' تھا، یہ مولانا اسحٰق سندیلوی ندوی کی کتاب تھی اور تقریبا اسی زمانہ میں ندوۃ المصنفین سے حامد الانصاری غازی صاحب کی کتاب ''اسلام کا نظام حکومت'' شائع ہوئی۔ علامہ سید سلیمان ندوی کی سیرت النبی کی آخری جلد اسی موضوع پر ہے یہ بہت اچھی کتاب ہے اگر چہ وہ نامکمل رہ گئی ہے، پاکستان کی حکومت نے اسے انعام سے بھی نوازا علامہ شبلی نے الفاروق میں اسلامی نظام سیاست وحکومت کی عملی تصویر پیش کی تھی، مولانا مودودی کی کتاب ''اسلامی ریاست'' اسی موضوع پر ہے یہ مولانا مودودی کی مختلف تحریروں کا مجموعہ ہے جسے پروفیسر خورشید صاحب نے بہت محنت سے مولانا کی مختلف کتابوں سے نکال کر جمع کردیا ہے ان کی کتاب '' خلافت وملوکیت''میں بھی سیاسی مباحث آگئے ہیں ۔مولانا تقی عثمانی کی ایک کتاب بھی اسی موضوع پر ہے ۔مولانا ابوالکلام آزاد نے اس موضوع پر '' مسئلہ خلافت اور جزیرۃ العرب'' لکھی۔ان کتابوں کی روشنی میں موجودہ مسلم حکومتوں کو دیکھا جاسکتا ہے، یہ حکومتیں اسلامی نظام سے کتنی دور ہیں، سائنس اور ٹکنولوجی جو طاقت کا سرچشمہ ہیں ان کے حصول میں بھی ان حکومتوں نے کیسی مجرمانہ کوتاہی برتی ہے۔ اب بہت سے لوگوں کے نزدیک اسلامی نظام سیاست کی ضرورت ہی باقی نہیں رہ گئی وہ اسلامی نظام حکومت اور مسلم حکومت کو ایک سمجھنے لگے ہیں کیونکہ ایک طویل زمانہ گذر گیا اور اسلامی نظام حکومت کا روشن چہرہ لوگوں کے سامنے نہیں آیا۔ اور جو لوگ اس کے علم بردار بن کر سامنے آئے انہیں دار ورسن کا سامنا کرنا پڑا۔

بیسویں صدی شروع ہوئی تو عالم اسلام مغربی تہذیب کی یلغار کو اسلامی تہذیب کی ڈھال سے اور علمی تصنیفات کے جوشن سے روکنے کی کوشش کر رہا تھا عرب دنیا میں جمال الدین افغانی کے شاگرد شیخ محمد عبدہ اور رشید رضا تھے اور دوسرے بہت سے اصحاب قلم تھے جن کی اسلامیات پر طاقتور اور فکر انگیز تحریریں دل ودماغ کو روشنی دے رہی تھیں، ان کی کتابیں بازار میں زیادہ مقبول ہورہی تھیں۔ حسن البناء کی شخصیت تھی ، اخوان المسلمون کی تحریک کے متعدد مصنفین تھے جنہوں نے قلم کے میدان میں شہسواری اور پختہ کاری اور گوہر باری کا

ثبوت دیا اور مغربی افکار کا کامیاب مقابلہ کیا اور اسلامی نظام کی اہمیت دلوں مں پیدا کی، مولانا علی میاں نے عصر حاضر کی سب سے بڑی اسلامی تحریک الاخوان المسلمون کے بارے میں یہ جملہ کہا تھا لا یبغضهم الا منافق ولا یحبتهم الا مؤمن یعنی جوان سے نفرت کرے وہ منافق اور جو ان سے محبت کرے وہ مؤمن، ایک صاحب فکرونظر بصیرت مند عالم دین کے اس قول کی روشنی میں بہت سے حاکمان وقت اور کئی ''شیوخ وامام'' ان منافقوں کی فہرست میں آئیں گے جو اخوان کو دہشت گرد قرار دیتے ہیں۔ یہ حاکمان وقت خود دہشت گرد ہیں کیونکہ انہوں نے دینی قیادتوں کو ظلم اور جارحیت سے دہشت زدہ کرنے کوشش کی ہے۔ شاہ فیصل کے زمانہ تک یہ مملکت، الاخوان المسلمون کی مکمل حمایت اور تایید میں تھی اور اس کی سرپرستی کر رہی تھی۔ لیکن وہاں کی حکومت نے اب ''یوٹرن'' لے لیا ہے، برصغیر میں مسلمانوں میں بیداری پیدا کرنے میں علامہ اقبال کے کلام کا بہت بڑا ہاتھ ہے، اقبال اور دوسرے علماء اسلام نے مسلمانوں کو اسلام کا رخ روشن دکھایا اور اسلامی نظام کی باز دید کا جذبہ ان کے اندر پیدا کیا۔ اسی کاروان علم وقلم میں مولانا ابوالحسن علی ندوی کا نام بھی آتا ہے جنہوں نے تقریر وتحریر کے ذریعہ تزکیہ و اصلاح کے ساتھ ساتھ مسلم ممالک میں اسلام کے احیاء کی کوشش کی اور نئی نسل کی شاخوں کو دین اسلام کے شجر سے وابستہ رکھنے میں زبان وقلم کی پوری طاقت صرف کی۔ مصر میں جب فرعونیت کے احیاء کی کوشش ہوئی اور عرب قومیت کا نعرہ بلند کیا گیا تو مولانا کی تحریریں صور اسرافیل بن گئیں ان کا قلم تیغ اصیل بن گیا اور ان کی تحریریں بر صغیر ہندستان سے لے کر تمام عرب ملکوں میں پڑھی گئیں کیونکہ مولانا کی عربی نثر اردو سے زیادہ دلکش اور زیادہ طاقتور تھی، پھر مولانا کی کتابوں کے دنیا کی زبانوں میں ترجمے ہوئے، عربی زبان میں بہترین انشا پردازی اور طاقتور اسلوب مولانا کی وہ خصوصیت ہے جس میں برصغیر کا کوئی عالم ان کا ہمسر نہیں اور اسی وجہ سے وہ پورے عالم اسلام کو ایک ساتھ خطاب کرنے کے لائق ہوئے مولانا نے اسلامی شریعت کے نفاذ کے ساتھ علوم جدیدہ کی طاقت سے بہرہ ور ہونے کی بھی نصیحت کی، مولانا کے یہ خیالات ان کی کئی کتابوں میں موجود ہیں۔ لیکن حکمرانوں نے مولانا کی بات نہیں مانی، انہوں نے اپنے ملکوں میں آئین اسلام کو منسوخ کو کر ڈالا، آئین مغرب کو نافذ کر ڈالا۔ مصر وشام لبنان وعراق والجزائر سب جگہ یہی ہوا۔ پاکستان اسلام کے نام پر بنایا گیا تھا لیکن وہاں ایک دن بھی اسلامی حکومت قائم نہیں ہوئی۔ اب کچھ مرکز اسلام کے بارے میں۔ مقطع میں آپڑی ہے سخن گسترانہ بات۔ یہ مرکز اسلام علم وہنر میں سب سے پسماندہ ہے۔ اب اگر یروشلم ہاتھ سے نکلتا ہوا نظر آرہا ہے تو اس میں قصور اپنا ہے بقول اقبال'' ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات'' اللہ نے پٹروڈالر کا سمندر ان خلیجی ملکوں کو بخشا تھا لیکن ان ملکوں نے صحیح منصوبہ بندی نہیں کی۔ اور پوری قوم کو صارفین کی قوم بنا ڈالا۔ مولانا ابوالاعلی مودودی اور مولانا ابوالحسن علی ندوی برصغیر کی دو اہم شخصیتیں رہی ہیں۔ عالم اسلام کی دینی قیادت کے لئے دونوں گویا آفتاب اور ماہتاب۔ دونوں کامل اسلامی نظام کے علم بردار تھے عہد خلافت راشدہ کو آئیڈیل سمجھتے تھے۔ سعودی عرب میں شاہ فیصل کے دور سے کچھ پہلے اور کچھ بعد تک خیر کے کام بہت ہو رہے تھے نہ صرف ملک کے اندر بلکہ عالم اسلام کی ارجمندی اور ملت اسلامیہ کی سربلندی کے لئے اقدامات کئے جا رہے تھے جیسے مدینہ یونیورسیٹی کا قیام اور رابطہ عالم اسلامی کا قیام وغیرہ، شاہ فیصل کے زمانہ تک سب سے بڑی دینی تحریک الاخوان المسلمون کی مکمل حمایت اور سرپرستی ہو رہی تھی اس لئے ان دونوں شخصیتوں نے ملوکیت کے نظام کے باوجود سعودی عرب کے ساتھ مشوروں اور نصیحت کے ساتھ تعاون کا موقف اختیار کیا جیسا کہ اسلامی تاریخ کے بہت سے علماء نے صالح بادشاہوں کے ساتھ بعض اختلاف کے باوجود تعاون اور تایید کا موقف اختیار کیا۔ لیکن افسوس کہ مرکز اسلام نے اور دیگر خلیجی ملکوں نے حالیہ کچھ عرصہ میں اسلام کش پالیسیوں سے اپنی دینی حیثیت کو مجروح کیا ہے۔ یہ حکومتیں مصر میں اخوان کی حکومت کو گرانے کی سازش میں شریک

ہوگئیں اور عبدالفتاح سیسی کی اربوں ڈالر سے مدد کی، کثیر تعداد میں اپنے یہاں علماء کو زنداں میں ڈال دیا او راخوانی شخصیت یوسف القرضاوی کو جنہیں پہلے فیصل ایوارڈ سے نوازا گیا تھا انہیں بھی دہشت گرد قرار دے ڈالا۔ اور اب ''معتدل اسلام'' کے پردہ میں مغربی تہذیب اور ثقافت کو دراندازہونے کا موقعہ دیا جارہا ہے۔ حرم کی بے حرمتی اہل حرم کے ہاتھوں ہو رہی ہے۔ ہم پہلے سمجھتے تھے ''حرم کے رہنے والے ایسے نامحرم نہیں ہوں گے'' لیکن اب دینی قیادت کو پریشان کیا جارہا ہے ان کو دہشت گرد قرار دیا جارہا ہی وہ بالیسیاں اختیار کی جارہی ہیں جو اخوت اسلامی کے منافی ہیں گویا ''چوں کفر از کعبہ برخیزد'' سے ملتی جلتی صورت حال بنتی جارہی ہے۔ ان غلط پالیسیوں کا نتیجہ ہے کہ اسرائیل طاقت میں شہباز کی طرح ہے اور عرب ملک ممولے کے مانند۔ اب اس بات کا یقین ہے کہ موجودہ صورت حالات میں مولانا ابوالاعلی مودودی اور مولانا ابوالحسن علی ندوی بقید حیات ہوتے تو ان کے لب اظہار پر اس وقت تالے نہ لگتے اور زبان وقلم سے عرب ملکوں کی ناروا اور نازیبا صورت حال پر اپنی تکلیف کا برملا اظہار کرتے۔ حرم کسی کی جاگیر نہیں ہے پوری دنیائے اسلام کا اس پر حق ہے۔ عرب دنیا میں کسی کو بولنے اور لکھنے کی اس وقت آزادی حاصل نہیں ہے۔ لیکن برصغیر کے ہمارے علماء اور قائدین کے ہونٹوں پر تالے اور زبان قلم پر چھالے اور ان کی زبان دہن میں آبلے کیوں پڑ گئے ہیں۔ غالبا حرمین کے تقدس کے خیال سے انگشت نمائی اور لب کشائی وہ مناسب نہیں سمجھتے ہیں حالانکہ فرماں رواوں کی غلطی اور اسلام سے بیگانہ وشی اتنی سنگین ہے کہ اس پر خاموشی مناسب نہیں ہے۔ علماء کی ذمہ داری ہے کہ وہ مہر سکوت توڑیں اور حق بات کہیں اور حق بات لوگوں تک پہونچائیں اور حق کی آواز بلند کریں۔ غیر علماء اور عوام دو قسم کے ہیں ایک وہ ہیں جو باشعور ہیں اور ان حالات کا درد دل میں محسوس کرتے ہیں دوسرے وہ ہیں جو بےشعور اور مردہ ہیں اور ان کے دلوں سے احساس زیاں جاتا رہا۔

انیسویں صدی اور بیسویں صدی میں برصغیر اور عالم اسلام کے علماء نے مسلم امت کو بیدار کرنے اور اسلامی نظام کے احیاء کی جتنی کوششیں کیں مطلق العنان مسلم عرب حکمرانوں نے ان سب پر پانی پھیر دیا، مصلحین امت کے خوابوں کو چکنا چور کردیا، اسلامی نظام کو برسر عمل کرنے کے ان کے منصوبوں کو خاک میں ملادیا، اصلاحی کوششوں کے ستون کو منہدم کردیا، ان کی کتابوں پر پابندی عائد کردی یہ بیسویں صدی اور اکیسویں صدی کا سانحہ کربلا ہے، حکایت خوں چکاں ہے، روز قیامت مصلحین امت کا ہاتھ ہوگا اور ان حاکمان وقت کا گریباں، ملت کے مصلحین اور علماء اور صالحین، اسلام کے مکمل نظام کو بروئے کار دیکھنا چاہتے تھے وہ اسلامی نظام خلافت کا احیاء چاہتے تھے اب جو ان میں زندہ ہیں وہ سب اسیر اور پابزنجیر ہیں، ہر مسلم ملک میں اسلامی نظام کی دعوت قابل تعزیر جرم بن گئی ہے۔ متعین طور پر کسی ایک عرب ملک کو تنقید کا ہدف بنانا مقصود نہیں ہے یہاں آوے کا آوا بگڑا ہوا ہے۔ یورپ اور امریکا میں اسلام کے خلاف معاندانہ رویہ اختیار کیا گیا اور اسلام کو دہشت اور تشدد کا مذہب قرار دیا گیا عرب ملک احساس کمتری میں مبتلا ہوکر اور مرعوب ہوکر اب صفائی پیش کررہے ہیں اور دینی قیادت کو پا بجولاں سر مقتل لے جارہے ہیں، ترقی کی شاہراہ پر وہ ترقی یافتہ قوموں کے ہم سفر نہیں ہیں، جنہیں میر کارواں ہونا چاہئے تھا وہ گرد کارواں بھی نہیں ہیں۔ نہ کہیں نسیم سحر ہے، نہ کہیں بہار کا منظر ہے، آشیاں جل گیا ہے گلستاں لٹ گیا ہے، بلبلیں صیاد سے مانوس ہوچکی ہیں اور اس کے دام فریب میں گرفتار ہونے کے لئے تیار ''طائروں پر سحر ہے صیاد کے اقبال کا''۔ اور اب ''معتدل اسلام'' کے نام پر نئے شہر بسائے جارہے ہیں۔ مصلحین امت نے جو کوششیں کی تھیں وہ خاک میں مل گئیں ان کا نخل تمنا ہرا نہ ہوسکا ان کے خواب شرمندہ تعبیر نہ ہوسکے۔

دیکھو وہ میرے خواب تھے دیکھو یہ میرے زخم ہیں
میں نے تو سب حساب جاں برسر عام رکھ دیا

☆☆☆

❑ خاص تحریر

فلسطین، وعدۂ بالفور سے وعدۂ امریکہ تک

(ظلم وجارحیت اور مفکر وفریب کے سو سال)

مجیب الرحمٰن عتیق ندوی

فلسطین ایک ایسی بابرکت سرزمین ہے جس کو خداوند قدوس نے بے شمار ظاہری وباطنی، جسی و روحانی برکتوں سے مالامال فرمایا ہے، بیت المقدس اسی خطہ بابرکت کا اہم شہر ہے، ارض فلسطین انبیاء کرام کی سرزمین رہی ہے، کتنے ہی پیغمبر وانبیاء اس کی خاک میں محوخواب ہیں، نبی آخرالزماں محمد عربی ﷺ کو مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ کا سفر کرایا گیا، اور مسجد اقصی میں آپ نے انبیاء علیہم السلام کی امامت فرمائی، اور مسجد اقصی کی فضاؤں سے ہی آپ ﷺ کو معراج کے سفر مبارک پر بلایا گیا ہے، مکہ مکرمہ سے حضور ﷺ کا بیت المقدس تک کا سفر، اور مسجد اقصی میں انبیاء کرام کی امامت اور وہاں سے معراج کا سفر محض کوئی اتفاقی واقعہ نہ تھا، بلکہ خدا کے تکوینی نظام میں مستقبل کی تبدیلیوں کے بہت دقیق اشارے تھے، یہ اس کا واضح اشارہ تھا کہ مسجد اقصی ومسجد حرام دو قالب وایک روح ہیں، دونوں کی اساس وبنیاد اور خمیر ووجود میں خدا کی توحید اور اس کی بندگی کا عنصر ہے، دونوں کا ہدف ومقصد یہ ہے کہ وہ نغمۂ توحید سے معمور ہوں، دونوں مسجدوں کا آپس میں ایسا رشتہ ہے جیسا ناخن کا گوشت کے ساتھ رشتہ ہوتا ہے، سفر اسراء ومعراج میں یہ بھی اشارہ تھا کہ اب امتوں کی قیادت کی زمام نبی آخرالزماں محمد عربی ﷺ کے ہاتھ میں ہوگی، انسانی قافلے اب انہی کی سیادت ورہنمائی میں سفر کریں گے، محض خاکی ہی نہیں ناری ونوری بھی ان کی قدم بوسی کے شرف کا اعزاز حاصل کریں گے، ان مقاصد کے اظہار اور معراج نبوی کی ایک منزل کے طور پر بیت المقدس ومسجد اقصی کا انتخاب اس کے مقام بلند کی دلیل اور اس خطہ ارض کی عظمت کا ثبوت ہے، اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ فلسطین ظاہری وباطنی برکتوں کا منبع ہے، قرآن مجید نے اس کو بجا طور پر ''الأرض التی بارکنا فیھا'' کا پروانہ تقدس عطا کیا ہے،

فلسطین وبیت المقدس کے خلاف بہت سی سازشوں اور مکروفریب کے تانے بانے تاریخ نے محفوظ رکھے ہیں، مختلف ادوار میں اس بقعہ ارض کے قلب وجگر پر بہت سے حملے کئے گئے ہیں، دور اخیر میں صلیبیوں نے اس پر اور مسلمانوں پر ایسے حملے کئے کہ ان کی حیوانیت وبہیمیت کے آگے جنگل کے درندوں کی روح کانپ اٹھی، بدترین قتل وغارت گری ہوئی، شہر مقدس کی زمین لالہ زار اور اس کی فصیلیں خون میں نہا گئیں، اس کے بعد مسجد اقصی کے منبر ومحراب توحید خداوندی کے نغموں سے محروم اور وہ مسجد عشاق الٰہی کے سجدوں سے دور ہوگئی، یہ سب ظلم وجارحیت کا کھیل اس کے ساتھ کھیلا گیا، مگر اس سرزمین کے ساتھ جو مکر وسازش، ظلم وجارحیت، دجل وفریب کا جال انبیاء کی قاتل ملعون ومغضوب قوم یہود کے ذریعہ تیار کیا گیا وہ انتہائی بدترین وخوفناک ہے، انہوں نے ارض قدس کی حرمت کو اپنے ابلیسی وشیطانی قدموں سے پامال

کیا، حقائق کو مسخ کیا گیا، اور تاریخ میں تحریف کی، آدم خوروں نے آدم زادوں کا قتل اور خوں ریزی ہی نہیں کی بلکہ ان کے فکر وعقیدے اور تہذیب وتمدن پر بھی شب خون مارا، ان کی سازشوں نے صرف خلافت اسلامیہ کی بساط ہی نہیں لپیٹی، بلکہ اہل اسلام کی صفوں میں بہت سے منافقین وضمیر فروش، ایمان بے زار افراد پیدا کر دئے، جن کے مسلمان نما کردار اور منافقانہ طرز فکر نے ہر قدم پر یہود کو فائدہ پہنچایا، اور ان کے مقاصد کی تکمیل میں راہیں ہموار کیں، اور آج انہوں نے اسلام واہل اسلام کو ایسے دوراہے پہ لا کر کھڑا کر دیا جس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی،

مسجد اقصی اور فلسطین کے خلاف ان کی سازش وفریب کی داستان بہت طویل بھی ہے، اور حیرت انگیز وخوفناک بھی، ارض فلسطین کے خلاف کی گئی یہودی وعالمی سازشوں میں وعدہ بالفور(Balfour Decleration) کو بڑی اہمیت حاصل ہے، یہ وعدہ فلسطین میں یہودی قومی وطن کی تاسیس میں سنگ میل سمجھا جاتا ہے، یہ خفیہ معاہدہ نومبر ۱۹۱۷ء میں برطانوی وزیر خارجہ کے یہود کے نام ایک مکتوب کے ذریعہ طے پایا تھا، اس معاہدہ پر ایک صدی کا عرصہ گذر چکا ہے، ٹھیک سو سال کی آزمائشوں، اور دجل وفریب، اور عالمی سازشوں، ظلم وجارحیت کی ایک صدی گذرنے کے بعد امریکہ بہادر کے ذریعہ بیت المقدس کو اسرائیل کا دارالحکومت بنانے کا اعلان کیا گیا ہے، جو خود وعدہ بالفور کی طرح ایک ظالمانہ واحمقانہ فیصلہ ہے، آیئے جائزہ لیتے ہیں کہ اس سو سال کی دلخراش داستان اور اس کے بعد اس امریکی ظالمانہ فیصلہ کا خلاصہ کیا ہے؟ اس سازش ومکر کا قصہ کیا ہے؟

ارض فلسطین کو یہودی ریاست(Jewish State) بنانے اور مسجد اقصی کی جگہ ہیکل سلیمانی(Temple of Soloman) کی تعمیر کے لئے یہودیوں کی منظم کوششیں عالمی صہیونی تنظیم (World Zionest Movment) کے ذریعہ ۱۸۹۷ء کی ''بال کانفرنس'' کے انعقاد سے شروع ہوئی ہیں، جو مشہور صہیونی لیڈر'' تھیوڈر ہرزل'' کی سربراہی میں منعقد ہوئی تھی، اس کانفرنس میں یہودی ریاست کے قیام کی تجویز منظور کی گئی، اور ساتھ ہی فلسطین کو یہود کا قومی وطن (Home Land) بنانے کا منصوبہ تیار کیا گیا، یہودیوں کو ساری دنیا سے اکٹھا کر کے فلسطین میں جمع کرنے پر تحریض کی گئی، اسرائیل کے قیام اور عالمی یہودی ریاست کا منصوبہ تشکیل دیا گیا، اقوام عالم کی آنکھوں میں دھول جھونک کر حقائق کو مسخ کر کے زبردستی ایک قوم کے ملک کو چھیننے کی سازش رچی گئی، اولا تو یہود نے اس منصوبہ کی تکمیل کے لئے خلیفۂ وقت سلطان عبدالحمید ثانی سے سودے بازی کرنا چاہا، مگر اس کوہ استقامت، اور اس کی صلابت وغیرت کے آگے منھ کی کھائی، اس غیور وباحمیت انسان نے ایک بالشت زمین قدس کا سودا کرنے سے صاف انکار کر دیا، اور کسی قیمت اس کو فروخت کرنے پر تیار نہیں ہوا، بالآخر ناکام ونامراد یہودی وفد نے واپس آنے کے بعد عالمی استعماری طاقتوں کی چاکری کر کے ان کی خوشنودی حاصل کی، اور یوں اسلام دشمن طاقتوں اور مسلمانوں کے ہاتھوں ہزیمت خوردہ عناصر کو موقع ہاتھ آ گیا کہ اسلام کے خلاف کچھ نہ کچھ کریں، یہود نے ان عالمی طاقتوں اور اسلامی صفوں کے منافقین کے ذریعہ ایسی سازشیں تیار کیں کہ ایک طرف خلافت اسلامیہ کی بساط لپیٹ دی گئی، اور خلافت کے خاتمہ کے بعد یہودی نواز، منافق وبدکردار شخص ''اتاترک'' کو اس منصب پر سرفراز کر دیا گیا، جہاں سے یہودی مقاصد کے تکمیل کی راہیں مزید ہموار ہوتی چلی گئیں، اسلام کی بے کسی وبے بسی، اور مظلومیت وبے چارگی کا مزید سامان ہوا، دوسری طرف یہودی عالمی طاقتوں اور طاغوتوں کی ہمدردیاں وتائید حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے، برطانیہ وعالمی قوتوں اور یہود کی سازشوں سے یہودی ریاست کے تخیل اور اس کے منصوبہ کی تکمیل کا آغاز ہوا، ان کوششوں میں بنیادی حیثیت وعدہ

بالفور(Balfour Decleration) کو حاصل ہے، وعدہ بالفور کا پس منظر یہ بھی تھا کہ یہودیوں نے اپنی طے شدہ سازش کے تحت اس فریب کو عام کرنا شروع کیا کہ یہودی ایک پریشاں حال قوم ہیں جن کا کوئی قومی وطن نہیں ہے، وہ خانماں برباد(Nation without land) ہیں، انہوں نے اپنے بارے میں اس فریبی تصور کو عام کیا اور ہمدردیاں بٹورنے میں کامیاب ہوگئے، اسی طرح فلسطین کے بارے میں یہ تصور عام کیا گیا کہ وہ سرزمین کسی کی ملکیت نہیں ہے، ارض فلسطین بغیر ملکیت کی زمین(Land without Nation) ہے، اب ان دونوں جملوں کو ملائیں تو اس کا صاف مطلب یہ تھا یہ "بغیر ملکیت کی زمین" اس قوم کو ملنی چاہئے جس کے پاس کوئی وطن نہیں ہے، اس مفروضہ وفریب کو خوب عام کیا گیا، یہاں تک کہ برطانوی وزیر خارجہ "آرتھر بالفور"(Arther James Balfour)(۱۸۴۸ء-۱۹۳۰ء) نے نومبر ۱۹۱۷ء کو مشہور یہودی لیڈر" لیونل والیٹر روتھشیلڈ"(Lional Walter Rothchild) کے نام اپنے ایک تاریخی مکتوب میں یہودیوں کے لئے فلسطین کو قومی وطن بنانے کا وعدہ اور اس کے لئے برطانیہ کے تعاون کی یقین دہانی کرائی تھی، یہ مکتوب یہودی سازش و برطانوی بددیانتی اور ظلم کا آئینہ دار ہے، اور مسلمانوں کے ساتھ برطانیہ کی جارحیت وبدعہدی کا بدنما داغ ہے، اسی خط نے سرکاری وقانونی طور پر فلسطین کو یہودیوں کے قومی وطن کی تجویز کو عملی جامہ پہنانے میں بنیادی کردار ادا کیا ہے، یہ برطانیہ کا شرمناک کردار اور بددیانتی تھی کہ اس کے ایک وزیر نے بے دھڑک ایک قوم کو دوسری قوم کا وطن دینے کا وعدہ کیا، نہ برطانیہ کو اس کا حق تھا اور نہ ہی یہودیوں کا اس سے کوئی تعلق، برطانیہ نے یہود سے صرف وعدہ ہی نہیں کیا بلکہ تاریخ نے ثابت کردیا کہ اس وعدہ کی وفا کے لئے عملی طور پر قیام اسرائیل کے لئے مستقل راہیں ہموار کی ہیں، اس کی تأسیس میں مکمل تعاون کیا، جس وقت برطانیہ نے یہود سے یہ وعدہ کیا اس وقت وہاں کے اصل باشندوں کی آبادی تقریبا ۹۲ فیصد تھی، مگر جمہوریت کے دعوے دار برطانیہ نے فلسطین کے عوام سے جمہوری اصول کے مطابق ان کی رائے لینا بھی ضروری نہ سمجھا، اور اس طرح انسانی واخلاقی اور جمہوری بنیادوں کا خون کرتے ہوئے یہود کو فلسطین میں قومی وطن بنانے کی منظوری دے دی گئی، اور اس طرح ان کے لئے ایک گونہ سہارا مل گیا جس کے ذریعہ ان کے لئے آگے کے منصوبے آسان ہوتے چلے گئے، بالکل اسی طرح امریکہ بہادر نے اسی فارمولہ پر عمل کرتے ہوئے آج بیت المقدس کو یہودی ناجائز ریاست اسرائیل کا دارالحکومت بنانے کا ظالمانہ ومجرمانہ فیصلہ صادر کیا ہے، جو اس کا اعلان ہے کہ سرزمین قدس اور مسجد اقصی سے مسلمانوں کو دست بردار ہوجانا چاہئے۔

برطانیہ کی بددیانتی اور ظلم وفریب کی تاریخ کے صفحات مزید دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ اس نے ۱۹۱۶ء میں شریف مکہ حسین بن علی کے ساتھ ایک معاہدہ کیا تھا، جو عرب برطانیہ معاہدہ (Arab Britian Declaration) کے نام سے مشہور ہے، شریف مکہ حسین بن علی اور مصر میں برطانوی نمائندہ" سر ہنری مکماہون"(Sir Henry McMahon) کی خفیہ مراسلت کے ذریعہ یہ معاہدہ انجام پایا کہ اگر شریف مکہ ترکوں سے دست بردار ہوجائیں، اور ان کا ساتھ نہ دیں، تو برطانیہ عرب خلافت کے قیام میں ان کا تعاون کرے گا، یہ معاہدہ ایک سازش اور صرف دھوکہ تھا، اس کا مقصد عرب قومیت کو بیدار کرکے ترکوں کے خلاف انہیں میدان میں اتارنا تھا، ایک طرف جب برطانیہ نے عربوں کو ان کی حکومت وریاست کے خواب دکھا کر ان سے معاہدہ کیا، دوسری طرف برطانیہ اور فرانس میں مزید ایک خفیہ معاہدہ عربوں سے متعلق کیا گیا، جو برطانوی نمائندہ "مارک سائیکس (Marc Sykes) اور فرانسیسی نمائندہ "جورج پیکوٹ" (Georges Picot) کے ذریعہ

پایہ تکمیل تک پہونچا، یہ معاہدہ بھی ۱۹۱۶ء میں مکمل ہوا، اس معاہدہ کی رو سے عرب ممالک کو برطانیہ وفرانس اور روس کے درمیان تقسیم کیا گیا تھا،

برطانیہ کے اس وعدہ کے بعد یہودی بلاخوف فلسطین میں اپنی آبادیاں قائم کرنے لگے، یہودیوں نے فلسطین پر قبضہ کرنے اور اپنی ریاست قائم کرنے کے خواب میں ہر حربہ استعمال کیا، اس وقت فلسطین برطانوی سامراج واقتدار کا حصہ تھا، اس لئے وہاں یہودیوں کو اور موقع تھا کہ ظلم وغنڈا گردی، لوٹ مار کے ذریعہ فلسطینیوں کو دہشت زدہ کرکے وہاں سے بھاگنے پر مجبور کرتے تھے، یہودی گماشتے پوری آزادی کے ساتھ ظلم ودہشت کا ماحول گرماتے تھے، ۱۹۴۵ء میں اقوام متحدہ نے فلسطین میں یہودی حق تسلیم کرتے ہوئے اس کے ایک حصہ پر یہودیوں کو اپنی حکومت بنانے کی قانونی آزادی دے دی، جنگ عظیم دوم کے بعد استعماری ملکوں کی کمر ٹوٹ چکی تھی، فلسطین پر برطانوی انتداب (British Mandate) کی حکومت قائم تھی، جنگ عظیم کے نتائج کے بعد برطانیہ نے فلسطین سے اپنے قبضہ کو ہٹانے کا فیصلہ کیا، لیکن برطانوی گورنر نے اقتدار یہود کے حوالہ کرکے وہاں سے رخت سفر باندھ لیا، مگر ساتھ ہی برطانیہ نے ۱۹۴۷ء میں واپس جانے سے پہلے فلسطین کی تقسیم کا بل انتہائی ناجائز طور پر اقوام متحدہ میں پیش کردیا، ۲۶/نومبر ۱۹۴۷ء کو اقوام متحدہ کے اجلاس میں فلسطین کا فیصلہ ہونا تھا، صورتحال ایسی تھی کہ شاید تقسیم کا فیصلہ نہ ہوتا، یا یہود کے مفاد میں نہ ہوتا کیوں کہ بہ ظاہر ممکنہ ووٹ کا حصول نظر نہیں آرہا تھا، اس لئے خلاف قانون اجلاس کو چند دن کے لئے ملتوی کردیا گیا، امریکہ، برطانیہ، اور یہودیوں نے زبردستی، لالچ اور دھونس کے ذریعہ کچھ ممالک کو تقسیم کے حق میں ووٹ دینے پر آمادہ کرلیا، چنانچہ نومبر ۱۹۴۷ء میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے فلسطین میں یہودیوں اور عربوں کے درمیان تقسیم کرنے کا فیصلہ صادر کردیا، تقسیم کی رو سے فلسطین کا ۵۵ فیصدی رقبہ ۳۳ فیصدی یہودی آبادی کو اور ۴۵ فیصدی رقبہ ۶۷ فیصدی عرب آبادی کو دیا گیا۔ حالانکہ اس وقت تک فلسطین کی زمین کا صرف چھ فیصدی حصہ یہودیوں کے قبضہ میں آیا تھا۔ یہ تھا اقوام متحدہ کا انصاف، جس کے ذریعہ صہیونی ریاست کے قیام کی مزید قانونی راہ ہموار ہوگئی، اس کے بعد یہود نے ۱۹۴۸ء میں اسرائیل کے قیام کا باقاعدہ اعلان کردیا اور عالمی استعماری طاقتوں نے اس ناجائز ریاست کو تسلیم کرلیا۔

جس طرح برطانوی بددیانتی کا آئینہ دار یہ وعدہ بالفور کا مکتوب ہے، اہل فلسطین کے ساتھ اسی طرح بہت سے ظالمانہ وغیر منصفانہ معاہدے ظلم وجور کی تاریخ نے محفوظ رکھے ہیں، وہ برطانیہ کے دجل وفریب کی مثال تھیں، جس نے قیام اسرائیل سے قبل اس کی راہ ہموار کی تھی، ان معاہدات کی تاریخ میں ایک اور معاہدہ امریکہ بہادر کی داستان ظلم کا وہ ہے جس کو ”معاہدہ اوسلو“ (Oslo Accord) کہا جاتا ہے، ۱۳/ستمبر ۱۹۹۳ء کو امریکہ، اسرائیل، اور سوچی سمجھی صہیونی سازشوں کے تحت امریکی صدر بل کلنٹن کے ذریعہ ناروے کے مشہور شہر ”اوسلو“ (Oslo) میں ایک معاہدہ طے پایا، جس پر اسرائیل کے وزیر خارجہ شمعون پیریز اور یاسر عرفات نے دستخط کئے، ہر معاہدہ کی طرح اس کا بھی خوبصورت عنوان باہمی مصالحت وجنگ بندی تھا، مگر اس کے ذریعہ اسرائیل جو اس وقت ۷۸ فیصد فلسطین پر قابض تھا، اس کے استحکام کی مزید راہیں ہموار ہوئیں، یہودی نوآبادیات کو سکون کے ساتھ پھیلنے کا سامان فراہم ہوا، فلسطینیوں کے ساتھ دھوکہ وفریب اور مکر ودجل کی نئی تاریخ شروع ہوئی، دونوں فریق نے ایک دوسرے کی قانونی حیثیت کو تسلیم کیا، تاریخ کی ادنی معلومات رکھنے والا بخوبی واقف ہے کہ اس پرفریب معاہدہ سے صہیونی ریاست کے استحکام کا مزید سامان فراہم ہوا، اور کو موقع دیا گیا کہ اپنے ظلم وجور کے شکنجہ مزید تیز

کرلیں، اپنی ناجائز ریاست کی توسیع اور اپنے خوابوں کی تکمیل میں مزید قدم بڑھائیں، وعدہ بالفور صہیونیت کی خدمت کے لئے برطانوی ظلم وفریب کی مثال تھی اور ''معاہدہ اوسلو'' امریکی بددیانتی کی مثال تھی،

وعدہ بالفور کے ظالمانہ وجابرانہ مکتوب پر ایک صدی کا عرصہ گذر چکا ہے، اس پوری مدت میں لاکھوں فلسطینیوں کو قتل کردیا گیا، بستیاں اجاڑی گئیں، لاکھوں کو ملک بدر کردیا گیا، مسئلہ صرف اس کا نہیں ہے کہ مسلمانوں کو بے شمار قربانیاں دینی پڑیں، شہادت مطلوب ومقصود مومن ہے، جنگ وجہاد اسلامی تاریخ کا حصہ ہے، زندگی اور قیام امن وامان کی ضمانت ہے، کشمکش ہماری تاریخ کا جزء ہے، خطرناک مسئلہ یہ ہے قیام اسرائیل کی کوششوں نے تاریخ میں تحریف کی ہے، حقائق کو مسخ کیا ہے، اور اپنے ناجائز وغیر قانونی حق کو ثابت کرنے کے لیے نئی تاریخ وضع کی ہے، انہوں نے کتنے افراد کے ضمیر وایمان کا سودا کیا ہے، افسوسناک بات یہ نہیں ہے کہ لاکھوں کی جانیں تلف ہوگئیں، افسوس ناک بلکہ خطرناک بات یہ ہے ہزاروں قلوب سے احساس زیاں ختم ہوگیا، کوئی آنکھ نہ رہی جو اسلام کی بے آبروئی اور قدس کی پامالی پر آنسو بہا سکے، وعدہ بالفور کی سوسالہ المناک تاریخ میں ہمیں کیا ملا؟ بے شمار انسانی قربانیاں اور شہادتیں، اسرائیل اور یہودی ریاست کا استحکام، اسلامی ممالک کی شکست وریخت، اور سب سے بڑھکر منافق حکام اور یہودیت نواز امراء کا وہ ٹولہ جس کے عیش ومستی، اور تعیش پسندی نے قباء حرم کو بھی تارتار کردیا، جن کے نفاق وظلم نے کن کن محاذوں پر اسلام کی بے آبروئی کا سامان کیا، حق پسندوں کی قوت گویائی اور حریت قول کو پابند سلاسل کردیا، ہمیں اس سوسال کی تاریخ نے وہ زخم دئے ہیں جن سے اسلام کا پورا بدن چھلنی ہے۔

جس طرح وعدہ بالفور کے لئے یہودیوں کی سازشوں نے میدان ہموار کیا تھا، اور اپنی کوششوں میں کامیاب ہوئے، اور ان ناپاک کوششوں کے بطن سے ناجائز اسرائیل کا وجود ظاہر ہوا، ٹھیک اسی طرح قیام اسرائیل کے بعد اب اس کی توسیع کے لئے یہودی لابی نے راہیں ہموار کیں، جو شخص، یا جو طاقت اسرائیل کی راہ کا کانٹا ہوسکتا تھا، اور اس کے لئے خطرہ اور سنگ گراں ہوسکتا تھا، اس کو صفحہ ہستی سے مٹادیا گیا، اور اس پر دہشت گردی، نانصافی وظلم، جور وتشدد کا الزام لگایا گیا، شرق اوسط کی موجودہ المناک صورتحال صرف توسیع اسرائیل ہی کا تو منظرنامہ ہے، آج بیت المقدس کو یہودی ریاست کا پایہ تخت بنانے کا اعلان صرف الفاظ وتعبیرات اور زمان ومکان کے لحاظ سے مختلف ہے، مگر اپنی سازش ومکر، ظلم وناانصافی، دجل وفریب، اپنی روح ومقصد اور ایک قوم کو دوسری قوم ومذہب کا جائز حق ناجائز طور پر دینے میں وعدہ بالفور سے الگ نہیں ہے، وہ ایک ہی سکہ کے دورخ اور ہی داستان ظلم وجور کے دوصفحات ہیں۔

قیام اسرائیل سے قبل خلافت کے خاتمہ کے بعد یہود کے پروردہ شخص کمال اتاترک کے ذریعہ اسلامی تہذیب وتمدن، اور اسلامی فکر وعقائد، اور نظام کو مسخ کیا گیا تھا، آج جو کردار سعودی امیرزادہ محمد بن سلمان کے ذریعہ نظر آرہا ہے کیا وہ اتاترک کی کردار سے ذرا بھی مختلف ہے؟ اس نے بھی اسلام کی شبیہ کو بگاڑا بلکہ اس کو ختم کرنے کا بیڑہ اٹھایا تھا، اور یہاں بھی ''معتدل اسلام'' (Modrate Islam) کے نام سے ایک نیا امریکی اسلام پیش ہے، جو اسلام کی مغربی تشریح سے ہم آہنگ اور امریکہ واسرائیل کی ''اسلامی تفسیر وترجمانی'' سے متفق ہے، یہ اسلام وہ ابلیسی نظام ہے جس نے بے ضمیر وبے غیرت حکمرانوں کے عہد میں ہمیشہ اسلامی وضع وصورت میں ظاہر ہونے کی کوشش کی ہے، موجودہ حکام کے نزدیک بھی صحیح معنی میں اسلام پسندی اور اسلامی فکر کی ترجمانی پر قید وبند اور ظلم وجور کی جدید شکلیں ہیں جیسا اتاترک کی نظام میں اسلامی تعلیم، قرآن وسنت کی اشاعت پر تھیں، اس نے ترکی کو مغربی سانچہ وقالب میں ڈھال کر اسلام کی رگ پر تیشہ چلایا،

یہاں جزیرۃ العرب کو فرنگی تخیلات دے کر ارض حرمین کو امریکی اسلام کے سانچہ میں فٹ کیا جارہا ہے، اتاترک کی نظام نے فکر اسلامی کی ترویج واشاعت پر سخت پابندیاں عائد کی تھیں، خلافت کی سرزمین کو مغربی فکر وتمدن کے دریا میں غرق کردیا تھا، آل سعود کی فرنگی فکر وتخیل نے دہشت گردی، تشدد ووہابی ازم کے خاتمہ کے نام پر نصاب تعلیم تک بدل ڈالنے کا فیصلہ کرلیا، اور کیا کچھ نہیں ہورہا ہے یہ اب کسی بصیرت مند کے لئے ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔

وعدہ بالفور پر پوری ایک صدی گذرنے کے بعد ۶؍ دسمبر ۲۰۱۷ء کو صدر امریکہ ڈونالڈ ٹرمپ نے امیریکی سفارت خانہ کو تل ابیب سے بیت المقدس منتقل کرنے کا اعلان کیا، یہ کوئی نئی بات نہیں تھی اور نہ یہ خود ٹرمپ کا فکرہ ومنصوبہ تھا، بلکہ یہ ایک قدیم فکر کی تنفیذ اور اس کا اعلان تھا، ۲۳؍ اکتوبر ۱۹۹۵ء میں امریکن کانگریس (American Congress) امریکی سفارت خانہ کو تل ابیب سے بیت المقدس منتقل کرنے کی قرارداد منظور کی تھی، جس کو (Jerusalem Embassy Act of 1995) کہا جاتا ہے، بعد میں آنے والے امریکی صدور اس کا وعدہ تو کرتے رہے، لیکن اس کی عملی تنفیذ کو انجام نہ دے سکے، یہ کام ڈونالڈ ٹرمپ کے حصہ میں آیا، چونکہ ٹرمپ نصرانی ہونے کے باوجود صہیونی فکر کا حامل تو ہے ہی، خود اس کا داماد ''جارید کوشنر'' (Jared Corey kushner) خود ایک یہودی ہے، امریکہ کی سرپرستی میں بیت المقدس کو ناجائز یہودی ریاست کا دارالحکومت بنانے کا اعلان دراصل صیہونی ریاست کی توسیع، اور اس کے ناپاک عزائم ومنصوبوں کی تکمیل کے لئے ایک نیا سازشی شاخسانہ ہے، اور عظیم اسرائیل (Greater Israel) کے خواب کا ایک حصہ ہے، اس کا صاف مطلب شہر قدس اور مسجد اقصی سے دست برداری ہے، یہ اعلان تو اب کیا گیا ہے مگر اس کے لئے راہیں بہت دن سے ہموار کی جارہی تھیں، مصر کی جائز وقانونی حکومت کے خلاف فوجی انقلاب کے ذریعہ اس کا خاتمہ، عراق کی تباہی، ملک شام کی خوں ریزی اور وہاں آگ وخون کا کھیل، یمن میں شیعہ سنی جنگ کے نام پر قتل وغارت گری وغیرہ یہ سب اسی اعلان کے مختلف اسٹیشن تھے جو یکے بعد دیگرے تاریخ کے افق پر ابھرتے رہے، ماضی قریب میں ٹرمپ کا دورہ سعودی عرب، اس کی سربراہی میں ریاض میں خلیجی حکمرانوں کی کانفرنس، اور پھر اس کے بعد پیش آنے والی تبدیلیاں اس کا واضح اشارہ تھیں کہ اب عالمی طاغوتوں کے ذریعہ کوئی بڑی کارروائی ہونے جارہی ہے، ارباب بصیرت پر اس وقت بھی عیاں تھا کہ سعودی میں ہونے والی چوٹی کانفرنس کے بعد صدر امریکہ نے ریاض سے براہ راست تل ابیب کا سفر آخر کیوں کیا ہوگا، صاف اشارے تھے کہ خلیجی حکمرانوں سے بیت المقدس کا سودا ہو چکا ہے، اس کے اعلان کے لئے مناسب وقت کا انتظار تھا، ماضی قریب میں خود محمد بن سلمان نے اسرائیل کا دورہ کیا، جس کی تصدیق اسرائیلی میڈیا نے بھی کی تھی، مگر خدمت حرمین کی دعوے دار حکومت نے اس پر پردہ ڈالنے کی ناکام کوشش کی، اس امریکی اعلان سے قبل ہی نام نہاد فلسطینی اتھارٹی کے صدر محمود عباس کو ریاض بلایا گیا، اور یہ پیش کش کی گئی اب شہر قدس کے عوض ''ابودیس'' (Abu Dis) نامی شہر کو قبول کرنے کئے تیار رہیں، اس کو دنیا کا حسین شہر بنادیا جائے گا، اور بیت المقدس یہود کے حوالہ کردیا جائے، یہ پیشکش خدام حرم نے سرزمین حرمین میں کی تھی، مڈل ایسٹ مانیٹر (Middle Est Monitor (MEM)) پر یہ خبر اس عنوان کے ساتھ ۶؍ دسمبر ۲۰۱۷ء کو شائع ہوئی تھی، (Saudi offers Abu Dis as future Capital of Palestien)، ''ابو دیس شہر کو فلسطین کا دارالحکومت بنانے کے لئے سعودی کی پیش کش'' اس مضمون میں نیویارک ٹائم کے حوالے سے لکھا گیا ہے کہ سعودی شہزادے محمد بن سلمان نے محمود عباس کو ریاض میں دعوت دی، اور اس کے سامنے یہ پیشکش رکھی، اور سعودی عرب نے اس پیشکش پر غور کرنے کے لئے

محمود عباس کو دو ماہ کا وقت دیا ہے،

(The New York Time reported on Sunday that Saudi crown prince Mohammad Bin Salman made the proposal during Palestinian President Mahmoud Abbas, visit Riyadh last mounth, accourding to the proposal, the Palestinians will get a non-contigous state in the West Bank and Gaza strip over which they will have only partial sovereignty while the majority of Israeli settlements in the West Bank will remain. The proposal does not grant Palestinian refuges and their descendants living in other countries the right of return to israel, according to the paper,Saudia Arabia gave Abbas two mounths to respond the offer.)

یہ تو کافی دن سے عیاں تھا کہ بت خانہ کو حرم سے پاسباں مل رہے ہیں، اور اب تو بشمول مملکت سعودیہ خلیجی امراء کا یہودی نواز منافقانہ کردار نوشتہ دیوار ہو چکا ہے، حیرت کی بات یہ ہے کہ امریکی اعلان کے بعد دنیا کے باحمیت وغیور، حریت پسند منصف مزاج افراد بے چین ہو گئے، ہر صاحب ایمان وضمیر تڑپ کر رہ گیا، مگر خلیجی امراء اور حکومت نواز علماء کا جو کردار سامنے آیا وہ اس کی دلیل ہے کہ ”حمیت نام ہے جس کا گئی تیمور کے گھر سے“ یقیناً یہ حمیت تو اسی دن رخصت ہو چکی تھی جب اسرائیل کی ناجائز ریاست کا قیام عمل میں آیا، مگر اب انتہائی افسوسناک بات یہ ہے کہ ہماری صفوں کے منافقین صرف اپنے حق، اپنے ایمان وضمیر سے دست بردار ہی نہیں ہو رہے ہیں بلکہ اپنی صیہونیت نوازی اور منافقت سے اسلام کی بے آبروئی اور اہل اسلام کی ذلت وشکست کا وہ سامان کر رہے ہیں، جس کی خلش صدیوں تک محسوس کی جائے گی، ”الجزیرۃ“ کی سائٹ پر یہودی اخبار یروشلم پوسٹ (Jerusalem Post) کے حوالے سے یہ دلخراش تبصرہ موجود ہے، جو کہ ۹ ردسمبر کو یہودی اخبار میں تبصرہ کیا گیا تھا کہ ”ان الفلسطينيين سيصابون بخيبة أمل اذا كانوا يتوقعون ردود فعل صارمة من الدول العربية تجاه قرار ادارة ترمب الاعتراف بالقدس عاصمة لاسرائيل، اگر فلسطینی باشندے ٹرمپ کے فیصلہ کے خلاف عرب حکومتوں کے سخت ردعمل کا انتظار کریں گے تو انہیں صرف مایوسی ہاتھ آئے گی“۔

اے غیرت فروشان عرب، اور صیہونیت نواز حکام وامراء! تم نے اسلام پسندی کا نام ”تشدد“ اور حمیت دین کا نام ”دہشت گردی“ عالمی دہشت گردوں کی رضاجوئی کے لئے رکھا ہے اور اسلام سے اپنی بیزاری پر مہر لگائی ہے، تم نے عزت وسربلندی طاغوت کی چاکری میں سمجھی ہے، یہود ونصاری سے تعلق ومودت کو تم نے اپنی خوش بختی اور نجات وکامرانی سمجھا ہے، خدا کے وعدو وعید کے مقابلہ اہل اسلام کے خلاف یہود ونصاری کی موالات ودوستی پر کیوں اعتماد ہے؟ کیا تم نے فراموش کر دیا کہ اسی طرح برطانیہ نے شریف مکہ کو ترکوں کے خلاف برانگیختہ کر کے عرب خلافت کا خواب دکھایا اور دھوکہ دیا تھا، ان سے دوستی وموالات کبھی ثمر آور نہیں ہو سکتی، ”أيبتغون عندهم العزة فان العزة لله ولرسوله وللمؤمنين“ یاد رہے کہ ان کے وعدے سراب خادع سے زیادہ کچھ نہیں، ان سے تعلق نقش بر آب سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں، ان کے سنہرے وعدوں پر یقین واعتماد کی نظر رکھنے والوں کو ”وعدہ بالفور“ اور ”وعدہ اوسلو“ کی تاریخ سے سبق لینا چاہئے، تاریخ نے اپنے دامن میں ان کی بے شمار فریب کاریاں محفوظ رکھی ہیں، آخر ہم نے اس جگر خراش صدی کی تاریخ میں ان کے وعدوں، معاہدوں اور موالات سے کیا

حاصل کیا ہے؟، بہر حال موجودہ اعلان کے بعد ایک وہ کردار ہے جو امریکہ واسرائیل کی خوشنودی یا مرعوبیت میں عرب حکام نے اختیار کیا ہے، اور ایک وہ ایمان افروز، حق شناس، غیرت وحمیت سے لبریز موقف ہے جو بیت المقدس کی آبرو پر اپنا قلب وجگر قربان کرنے والوں نے اختیار کیا ہے، جو بھی صاحب دل دونوں موقف کو دیکھتا ہے، صاف محسوس کرتا ہے کہ

پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں
شاہیں کا جہاں اور ہے کرگس کا جہاں اور

یہ بھی واضح رہے کہ سرزمین فلسطین ایمان ونفاق کی کسوٹی ہے، اس سے تعلق ووابستگی ایمان کی دلیل اور اس کی راہ میں قربانی عزت وسربلندی ہے، اس سرزمین کی رفاقت ومعیت نصرت خداوندی اور تائید ایزدی کی ضمانت ہے، حضور ﷺ نے صاف صاف فرمایا تھا کہ میری امت کا ایک گروہ حق پر قائم رہے گا، وہ دشمنان حق کی سرکوبی کرے گا، انہیں بے یارومددگار چھوڑنے والے ان کا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے، صحابہؓ نے ایسے حق پسندوں کی شناخت وعلامات معلوم کیں، تو حضور ﷺ نے فرمایا: ''ھم فی بیت المقدس واکناف بیت المقدس'' 'وہ گروہ بیت المقدس واطراف بیت المقدس میں ہوگا، سرزمین قدس کی محبت وتقدس اس طبقہ کے قلب وجگر میں پیوست ہوگی، اس کی راہ میں شہادت کا جذبہ ان کے دلوں میں رقصاں ہوگا، یہ افسانوی ادب کا کوئی جملہ نہیں بلکہ وحی ربانی کی زبان اور زبان نبوت کا فرمان ہے،

آج حماس کے قائدین اور سرزمین قدس کی اپنے خون سے حفاظت کرنے والے افراد اور ان کے قائدین کے ایسے ناگفتہ بہ صورتحال میں دیکھتے ہیں، ان کے حوصلہ اور فولادی عزم، ایمانی فراست، صبر وشکیبائی کو دیکھتے ہیں، ان کے جرأت مندانہ عزائم کو دیکھتے ہیں، تو معلوم ہوتا ہے کہ محض آہن پوش فوجوں، خوفناک ہتھیاروں اور مادی طاقت وقوت کے بل پر آج بھی حقیقی ایمان کو نہ خریدا جاسکتا ہے، نہ خوفزدہ کیا جاسکتا ہے، نہ سازشیں ان کے فولادی عزم میں ضعف ولچک پیدا کرسکتی ہیں، کوئی تو ہے جو جہاد ورباط کی سنت کا پاسباں اور اسلام کی عزت وشوکت کا نشان بنا ہوا ہے، حماس کے قائد خالد مشعل نے اپنے ایک بیان میں پوری جرأت وخود اعتمادی کے ساتھ فرمایا ''جس طرح ۱۹۱۷ء کا وعدہ بالفور اسرائیل کی تأسیس کی خشت اول تھا، ۲۰۱۷ء کا وعدہ ٹرمپ صہیونی ریاست کے تابوت کی آخری کیل اور اس کے خاتمہ کا اعلان ثابت ہوگا''۔

تعجب وحیرت اس پر نہیں ہے کہ امریکی صدر نے آج ریاست اسرائیل کا دارالحکومت بیت المقدس کو قرار دیا ہے، اور مسجد اقصی وشہر قدس کے خلاف سازش کی ہے، ان سے اسی کی توقع کی جاسکتی ہے، وہ ہمارے مقدسات کے خلاف سازش نہ کریں، یا ان کی حرمت کو پامال نہ کریں یہ ایسا ہی ہے کہ سانپ سے امید کی جائے کہ وہ نہ ڈسے، درندوں سے توقع کی جائے کہ درندگی سے باز رہیں، بھیڑیوں سے آس لگائی جائے کہ وہ خوں آشامی سے رک جائیں، امریکی صدر اور صہیونی ریاست کے علمبرداروں نے جو کچھ کیا وہ تو انہیں کرنا ہی تھا، حیرت اس شرمناک نفاق اور اپنی صفوں کے منافقین کی یہودیت نوازی پر ہے جو اپنے دین وایمان سے بھی غافل اور دشمنان حق کے مکروفریب سے بھی غافل ہیں، افسوس ملکوں کے تاراج ہونے اور خون بہنے سے زیادہ اس پر ہے عالم اسلام کی قیادتوں کے قلب وضمیر اور متاع غیرت وایمان لٹ گئی، ہمارا اس پر ایمان ہے کہ اسرائیل کا زوال حتمی ہے، اور مستقبل صرف اسلام اور اہل اسلام کا ہے، مگر ساتھ ہی ضرورت اس بات کی ہے کہ کون خدا کے تکوینی نظام انقلاب کی دستک کو اپنی بصیرت ایمان سے محسوس کرتے ہوئے غلبہ حق کی مساعی وجد جہد کا حصہ بنتا ہے اور کون باطل کی قربان گاہ پر اپنا ضمیر وایمان بھینٹ چڑھاتا ہے، اللہ تعالی اسلام کی آبرو اور حرم ثالث وسرزمین قدس کی حفاظت فرمائے،

☆☆☆

□ اسلامی تعلیمات

امت محمدیہ کا خاص اعتدال

مفتی محمد شفیع صاحبؒ

"وکذلك جعلناكم أمة وسطاً......"

لفظ وسط بفتح السین بمعنی اوسط ہے، اور خیر الامور اور افضل الاشیاء کو وسط کہا جاتا ہے، ترمذی میں بروایت ابو سعید خدریؓ آنحضرت ﷺ سے لفظ وسط کی تفسیر عدل سے کی گئی ہے، جو بہترین کے معنی میں آیا ہے (قرطبی)۔ اس آیت میں امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوۃ والسلام کی ایک امتیازی فضیلت وخصوصیت کا ذکر ہے، کہ وہ ایک معتدل امت بنائی گئی، اس میں یہ بتلایا گیا ہے کہ جس طرح ہم نے مسلمانوں کو وہ قبلہ عطا کیا، جو سب سے اشرف وافضل ہے، اسی طرح ہم نے امت اسلامیہ کو ایک خاص امتیازی فضیلت یہ عطا کی ہے کہ اس کو ایک معتدل امت بنایا ہے، جس کے نتیجہ میں ان کو میدانِ حشر میں یہ امتیاز حاصل ہوگا کہ سارے انبیاء علیہم السلام کی امتیں جب اپنے انبیاء کی ہدایت وتبلیغ سے مکر جائیں گی، اور ان کو جھٹلا کر یہ کہیں گی کہ ہمارے پاس نہ کوئی کتاب آئی، نہ کسی نبی نے ہمیں کوئی ہدایت کی، اس وقت امت محمدیہ انبیاء علیہم السلام کی طرف سے گواہی میں پیش ہوگی اور یہ شہادت دے گی کہ انبیاء علیہم السلام نے ہر زمانے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے لائی ہوئی ہدایت ان کو پہنچائی، اور ان کو صحیح راستہ پر لانے کی مقدور بھر پور کوشش کی، مدعی علیہم امتیں امت محمدیہ کی گواہی پر یہ جرح کریں گی کہ اس امت محمدیہ کا تو ہمارے زمانے میں وجود بھی نہ تھا، اس کو ہمارے معاملات کی کیا خبر، اس کی گواہی ہمارے مقابلہ میں کیسے قبول کی جاسکتی ہے۔

امت محمدیہ اس جرح کا یہ جواب دے گی کہ بے شک ہم اس وقت موجود نہ تھے، مگر ان کے واقعات وحالات کی خبر ہمیں ایک صادق مصدوق رسول نے اور اللہ کی کتاب نے دی ہے، جس پر ہم ایمان لائے اور ان کی خبر کو اپنے معائنہ سے زیادہ وقیع اور سچا جانتے ہیں، اس لئے ہم اپنی شہادت میں حق بجانب اور سچے ہیں، اس وقت رسول کریم ﷺ پیش ہوں گے، اور ان گواہوں کا تزکیہ وتوثیق کریں گے کہ بے شک انھوں نے جو کچھ کہا ہے وہ صحیح ہے، اللہ تعالیٰ کی کتاب اور میری تعلیم کے ذریعہ ان کو یہ صحیح حالات معلوم ہوئے۔

محشر کے اس واقعہ کی تفصیل صحیح بخاری، ترمذی، نسائی، اور مسند احمد کی متعدد احادیث میں مجملاً اور مفصلاً مذکور ہے۔

الغرض آیت مذکورہ میں امت محمدیہ کی اعلیٰ فضیلت وشرف کا راز یہ بتلایا گیا ہے کہ یہ امت معتدل امت بنائی گئی ہے، اس لئے یہاں چند باتیں قابلِ غور ہیں۔

اعتدال امت کی حقیقت، اہمیت اور اس کی کچھ تفصیل:

(۱) اعتدال کے معنی اور حقیقت کیا ہیں، (۲) وصفِ اعتدال کی یہ اہمیت کیوں ہے کہ اس پر مدار فضیلت رکھا گیا، (۳) اس امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوۃ والسلام کے معتدل ہونے کا واقعات کی رو سے کیا ثبوت ہے، ترتیب وار ان تینوں سوالوں کا جواب یہ ہے:

۱۔ اعتدال کے لفظی معنی ہیں برابر ہونا، یہ لفظ عدل سے

مشتق ہے، اس کے معنی بھی برابر کرنے کے ہیں۔

۲۔ وصفِ اعتدال کی یہ اہمیت کہ اس کو انسانی شرف و فضیلت کا معیار قرار دیا گیا، ذرا تفصیل طلب ہے، اس کو پہلے ایک محسوس مثال سے دیکھئے، دنیا کے جتنے نئے اور پرانے طریقے جسمانی صحت وعلاج کے لئے جاری ہیں، طبِ یانانی، ویدک، ایلوپیتھک، ہومیو پیتھک وغیرہ سب کے سب اس میں متفق ہیں، کہ بدنِ انسانی کی صحت اعتدال مزاج سے ہے، اور جہاں یہ اعتدال کسی جانت سے خلل پذیر ہو وہی بدنِ انسانی کا مرض ہے، خصوصاًطبِ یونانی کا تو بنیادی اصول ہی مزاج کی پہچان پر موقوف ہے، انسان کا بدن چار خلط خون، بلغم، سوداء، صفراء سے مرکب ہے اور انہی چاروں اخلاط سے پیدا شدہ چار کیفیات انسان کے بدن میں ضروری ہیں، گرمی ٹھنڈک، خشکی اور تری جس وقت تک یہ چاروں کیفیات مزاجِ انسانی کے مناسب حدود کے اندر معتدل رہتی ہیں وہ بدنِ انسانی کی صحت وتندرستی کہلاتی ہے، اور جہاں ان میں سے کوئی کیفیت مزاجِ انسانی کی حد سے زیادہ ہوجائے یا گھٹ جائے وہی مرض ہے، اور اگر اس کی اصلاح وعلان نہ کیا جائے تو ایک حد میں پہنچ کر وہی موت کا پیام ہوجاتا ہے۔

اس محسوس مثال کے بعد اب روحانیت اور اخلاقیت کی طرف آیئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ان میں بھی اعتدال اور بے اعتدالی کا یہی طریقہ جاری ہے، اس کے اعتدال کا نام روحانی صحت اور بے اعتدالی کا نام روحانی اور اخلاقی مرض ہے، اور اس مرض کا اگر علاج کر کے اعتدال پر نہ لایا جائے تو اس کا نتیجہ روحانی موت ہے، اور یہ بھی کسی صاحب بصیرت انسان پر مخفی نہیں کہ جوہرِ انسانیت جس کی وجہ سے انسان ساری مخلوقات کا حاکم اور مخدوم قرار دیا گیا ہے، وہ اس کا بدن یا بدن کے اجزاء و اخلاط یا ان کی کیفیات حرارت و برودت نہیں، کیوں کہ ان اجزاء و کیفیات میں تو دنیا کے سارے جانور بھی انسانیت کے ساتھ شریک بلکہ انسانیت سے زیادہ حصہ رکھنے والے ہیں۔

جوہر انسانیت جس کی وجہ سے انسان اشرف المخلوقات اور آقائے کائنات مانا گیا ہے، وہ اس کے گوشت پوست اور حرارت و برودت وغیرہ سے بالاتر کوئی چیز ہے، جو انسان میں کامل اور اکمل طور پر موجود ہے، دوسری مخلوقات کو اس کا وہ درجہ حاصل نہیں، اور اس کا معین کر لینا بھی کوئی باریک اور مشکل کام نہیں، کہ وہ انسان کا روحانی اور اخلاقی کمال ہے، جس نے اس کو مخدومِ کائنات بنایا ہے، مولانا رومیؒ نے خوب فرمایا ہے۔

آدمیت لحم و شحم وپوست نیست
آدمیت جز رضائے دوست نیست

اور اسی وجہ سے وہ انسان جو اپنے جوہرِ شرافت وفضیلت کی بے قدری کرکے اس کو ضائع کرتے ہیں ان کے بارے میں فرمایا۔

اینکہ می بینی خلافِ آدم اند
عیستند آدم غلافِ آدم اند

اور جب یہ معلوم ہوگیا کہ انسان کا جوہر شرافت اور مدارِ فضیلت اس کے روحانی اور اخلاقی کمالات ہیں، اور یہ پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ بدنِ انسانی کی طرح روحِ انسانی بھی اعتدال و بے اعتدالی کا شکار ہوتی ہے، اور جس طرح بدنِ انسانی کی صحت، اس کے مزاج اور اخلاط کا اعتدال ہے، اسی طرح روح کی صحت روح اور اس کے اخلاق کا اعتدال ہے، اس لئے انسان کامل کہلانے کا مستحق صرف وہی شخص ہوسکتا ہے جو جسمانی اعتدال کے ساتھ روحانی اور اخلاقی اعتدال بھی رکھتا ہو، یہ کمال تمام انبیاء علیہم السلام کو خصوصیت کے ساتھ عطا ہوتا ہے، اور ہمارے رسول کریم ﷺ کو انبیاء علیہم السلام میں بھی سب سے زیادہ یہ کمال حاصل تھا، اس لئے انسان کامل کے اولین مصداق آپؐ ہی ہیں، اور جس طرح جسمانی علاج معالجہ کے لئے ہر زمانہ اور ہر جگہ ہر بستی میں طبیب اور ڈاکٹر اور دواوں اور آلات کا ایک محکم نظام حق تعالیٰ نے قائم فرمایا ہے، اسی طرح روحانی علاج اور قوموں میں اخلاقی اعتدال پیدا کرنے کے لئے بنیاء علیہم السلام بھیجئے گئے، ان کے ساتھ آسمانی ہدایات بھیجی گئیں اور

بقدرِ ضرورت مادی طاقتیں بھی عطا کی گئیں، جن کے ذریعہ وہ یہ قانون اعتدال دنیا میں نافذ کرسکیں، اسی مضمون کو قرآن کریم نے سورۂ حدید میں اس طرح بیان فرمایا ہے:

لقد ارسلنا رسلنا بالبینٰت وانزلنا معهم الكتٰب والميزان ليقوم الناس بالقسط، وانزلنا الحديد فيه باس شديد ومنافع للناس.

یعنی ہم نے بھیجے ہیں اپنے رسول نشانیاں دے کر اور اتاری ان کے ساتھ کتاب اور ترازو تاکہ لوگ عدل وانصاف پر قائم ہوجائیں اور ہم نے اتارا لوہا اس میں سخت لڑائی ہے اور لوگوں کے کام چلتے ہیں۔

اس میں انبیاء علیہم السلام کے بھیجنے اور ان پر کتابیں نازل کرنے کی حکمت یہی بتلائی ہے کہ وہ ان کے ذریعہ لوگوں میں اخلاقی اور عملی اعتدال پیدا کریں، کتاب، اخلاق، اور روحانی اعتدال پیدا کرنے کے لئے نازل کی گئی، اور ترازو معاملات اور لین دین میں عملی اعتدال پیدا کرنے کے لیے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ ترازو سے مراد ہر پیغمبر کی شریعت ہو، جس کے ذریعہ اعتدالِ حقیقی معلوم ہوتا ہے اور عدل وانصاف قائم کیا جاسکتا ہے۔

اس تفصیل سے آپ نے یہ سمجھ لیا ہوگا کہ تمام انبیاء علیہم السلام کے بھیجنے اور ان پر کتابیں نازل کرنے کی اصل غرض وحکمت یہی ہے کہ قوموں کو اخلاقی اور عملی اعتدال پر قائم کیا جائے، اور یہی قوموں کی صحت مندی اور تندرستی ہے۔

امت محمدیہ میں ہر قسم کا اعتدال:

اس بیان سے آپ نے یہ بھی معلوم کرلیا ہوگا کہ امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوۃ والسلام کی جو فضیلت آیت مذکورہ میں بتلائی گئی، وكذلك جعلنكم أمة وسطاً، (یعنی ہم نے تمہیں ایک معتدل امت بنایا ہے)، یہ بولنے اور لکھنے میں تو ایک لفظ ہے؛ لیکن حقیقت کے اعتبار سے کسی قوم یا شخص میں جتنے کمالات اس دنیا میں ہوسکتے ہیں ان سب کے لئے حاوی اور جامع ہے۔

اس میں امت محمدیہ کو امت وسط یعنی معتدل امت فرما کر یہ بتلا دیا کہ انسان کا جوہرِ شرافت وفضیلت اس میں بدرجۂ کمال موجود ہے، اور جس غرض کے لئے یہ آسمان وزمین کا سارا نظام ہے، اور جس کے لئے انبیاء علیہم السلام اور آسمانی کتابیں بھیجی گئی ہیں، یہ امت اس میں ساری امتوں سے ممتاز اور افضل ہے۔

قرآن کریم نے اس امت کے متعلق اس خاص فضیلت کا بیان مختلف آیات میں مختلف عنوانات سے کیا ہے، سورۂ اعراف کے آخر میں امتِ محمدیہ کے لئے ارشاد ہوا:

وممن خلقنا أمة يهدون بالحق وبه يعدلون. (یعنی ان لوگوں میں جن کو ہم نے پیدا کیا ہے، ایک ایسی امت ہے جو سچی راہ بتلاتے ہیں اور اس کے موافق انصاف کرتے ہیں)۔

اس میں امت محمدیہ کے اعتدالِ روحانی واخلاقی کو واضح فرمایا ہے، کہ وہ اپنے ذاتی مفادات اور خواہشات کو چھوڑ کر آسمانی ہدایت کے مطابق خود بھی چلتے ہیں، اور دوسروں کو بھی چلانے کی کوشش کرتے ہیں، اور کسی معاملہ میں نزاع واختلاف ہوجائے تو اس کا فیصلہ بھی اسی بے لاگ آسمانی قانون کے ذریعہ کرتے ہیں، جس میں کسی قوم یا شخص کے ناجائز مفاد کا کوئی خطرہ نہیں۔

اور سورہ آلِ عمران میں امت محمدیہ کے اسی اعتدال مزاج اور اعتدالِ روحانی کے آثار کو ان الفاظ میں بیان فرمایا گیا ہے:

كنتم خير أمة أخرجت للناس تأمرون بالمعروف و تنهون عن المنكر وتؤمنون بالله، (یعنی تم سب امتوں میں بہتر ہو جو عالم میں بھیجی گئی ہو، حکم کرتے ہو اچھے کاموں کا اور منع کرتے ہو برے کاموں سے، اور اللہ پر ایمان لاتے ہو)۔

یعنی جس طرح ان کو رسول ﷺ سب رسولوں میں افضل نصیب ہوئے، کتاب سب کتابوں میں جامع اور اکمل نصیب ہوئی، اسی طرح ان کو قوموں کا صحتمندانہ مزاج اور اعتدال بھی اس اعلیٰ پیمانے پر نصیب ہوا، کہ وہ سب امتوں میں بہتر امت قرار پائی، اس پر علوم ومعارف کے دروازے کھول دیئے گئے ہیں، ایمان وعمل و تقویٰ کی تمام شاخیں اس کی قربانیوں سے سرسبز وشاداب ہوں گی،

وہ کسی مخصوص ملک و اقلیم میں محصور نہ ہوگی، بلکہ اس کا دائرۂ عمل سارے عالم اور انسانی زندگی کے سارے شعبوں کو محیط ہوگا، گویا اس کا وجود ہی اس لئے ہوگا کہ دوسروں کی خیر خواہی کرے، اور جس طرح ممکن ہو انہیں جنت کے دروازے پر لا کھڑا کر دے، أخرجت للناس میں اس کی طرف اشارہ ہے، کہ یہ امت دوسروں کی خیر خواہی اور فائدہ کے لئے بنائی گئی ہے، اس کا فرض منصبی اور قومی نشان یہ ہے کہ لوگوں کو نیک کاموں کی ہدایت کرے، برے کاموں سے روکے۔

ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ کے ارشاد الدین النصیحة کا یہی مطلب ہے کہ دین نام ہے کہ سب مسلمانوں کی خیر خواہی کرے، پھر برے کاموں میں کفر، شرک، بدعات، رسوم قبیحہ، فسق وفجور اور ہر قسم کی بد اخلاقی اور نامعقول باتیں شامل ہیں، ان سے روکنا بھی کئی طرح ہوگا، کبھی زبان سے، کبھی ہاتھ سے، کبھی قلم سے، کبھی تلوار سے، غرض ہر قسم کا جہاد اس میں داخل ہوگیا، یہ صفت جس قدر عموم واہتمام سے امت محمدیہ میں پائی گئی پہلی امتوں میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔

۳۔ اب تیسری بات غور طلب یہ رہ گئی کہ اس امت کے توسط واعتدال کا واقعات سے ثبوت کیا ہے، اس کی تفصیل طویل اور تمام امتوں کے اعتقادات، اعمال واخلاق اور کارناموں کا موازنہ کر کے بتلانے پر موقوف ہے، اس میں سے چند چیزیں بطور مثال ذکر کی جاتی ہیں۔

اعتقادی اعتدال: سب سے پہلے اعتقادی اور نظری اعتدال کو لے لیجئے، تو پچھلی امتوں میں ایک طرف تو یہ نظر آئے گا کہ اللہ کے رسولوں کو اس کا بیٹا بنا لیا، اور ان کی عبادت اور پرستش کرنے لگے۔ قالت الیھود عزیر ابن الله وقالت النصاری المسیح ابن الله، اور دوسری طرف انہی قوموں کے دوسرے افراد کا یہ عالم بھی مشاہدہ میں آئے گا کہ رسول کے مسلسل معجزات دیکھنے اور برتنے کے باوجود جب ان کا رسول ان کو کسی جنگ وجہاد کی دعوت دیتا ہے تو وہ کہہ دیتے ہیں: اذھب أنت وربك فقاتلا إنا ھھنا قاعدون (یعنی جایئے آپ اور آپ کا پروردگار ہی مخالفین سے قتال کریں، ہم تو یہاں بیٹھے ہیں)، کہیں یہ بھی نظر آتا ہے کہ اپنے انبیاء کو خود ان کے ماننے والے طرح طرح کی ایذائیں پہنچاتے ہیں۔

بخلاف امت محمدیہ کے کہ وہ ہر قرن اور ہر زمانے میں ایک طرف تو اپنے رسول ﷺ سے وہ عشق ومحبت رکھتے ہیں کہ اس کے آگے اپنی جان ومال اور اولاد وآبرو سب کو قربان کر دیتے ہیں۔

سلام اس پر کہ جس کے نام لیوا ہر زمانے میں
بڑھا دیتے ہیں ٹکڑا سرفروشی کے فسانے میں

اور دوسری طرف یہ اعتدال کہ رسول کو رسول اور خدا کو خدا سمجھتے ہیں، رسول اللہ ﷺ کو با ایں ہمہ کمالات وفضائل عبداللہ و رسولہ مانتے اور کہتے ہیں، وہ آپ کے مدائح ومناقب میں بھی یہ پیمانے رکھتے ہیں، جو قصیدۂ بردہ میں فرمایا:

دع ما ادعته النصارىٰ فی نبیھم
واحکم بما شئت مدحاً فیه واحتکم

(یعنی اس کلمہ کو تو چھوڑ دو جو نصاریٰ نے اپنے نبی کے بارے میں کہہ دیا، (کہ وہ معاذ اللہ خود خدا یا خدا کے بیٹے ہیں) اس کے سوا آپ کی مدح وثناء میں جو کچھ کہو وہ سب حق وصحیح ہے۔

جس کا خلاصہ کسی نے ایک مصرع میں اس طرح بیان کر دیا۔

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

عمل اور عبادت میں اعتدال:

اعتقاد کے بعد عمل اور عبادت کا نمبر ہے، اس میں ملاحظہ فرمایئے، پچھلی امتوں میں ایک طرف تو یہ نظر آئے گا کہ اپنی شریعت کے احکام کو چند ٹکوں کے بدلے فروخت کیا جاتا ہے، رشوتیں لے کر آسمانی کتاب میں ترمیم کی جاتی ہے، یا غلط فتوے دیے جاتے ہیں، اور طرح طرح کے حیلے بہانے کر کے شرعی احکام کو بدلا جاتا ہے، عبادت سے پیچھا چھڑایا جاتا ہے، اور دوسری طرف عبادت خانوں

میں آپ کو ایسے لوگ بھی نظر آئیں گے جنہوں نے ترک دنیا کر کے رہبانیت اختیار کر لی، وہ خدا کی دی ہوئی حلال نعمتوں سے بھی اپنے آپ کو محروم رکھنے اور سختیاں جھیلنے ہی کو عبادت وثواب سمجھتے ہیں۔

امت محمدیہ نے اس کے خلاف ایک طرف رہبانیت کو انسانیت پر ظلم قرار دیا، اور دوسری طرف احکامِ خدا اور رسول پر مر مٹنے کا جذبہ پیدا کیا، اور قیصر وکسریٰ کے تخت وتاج کے مالک بن کر دنیا کو یہ دکھلا دیا کہ دیانت وسیاست میں یا دین ودنیا میں بیر نہیں، مذہب صرف مسجدوں یا خانقاہوں کے گوشوں کے لئے نہیں آیا؛ بلکہ اس کی حکمرانی بازاروں اور دفتروں پر بھی ہے، اور وزارتوں اور امارتوں پر بھی، اس نے بادشاہی میں فقیری اور فقیری میں بادشاہی سکھلائی ؎

چو فقر اندر لباسِ شاہی آمد
زتدبیر عبید للہی آمد

معاشرتی اور تمدنی اعتدال:

اس کے بعد معاشرت اور تمدن کو دیکھئے، تو پچھلی امتوں میں آپ ایک طرف یہ بے اعتدالی دیکھیں گے کہ انسانی حقوق کی کوئی پرواہ نہیں، حق ناحق کی کوئی بحث نہیں، اپنی اغراض کے خلاف جس کو دیکھا اس کو کچل ڈالنا، قتل کر دینا، لوٹ لینا سب سے بڑا کمال ہے، ایک رئیس کی چراگاہ میں کسی دوسرے کا اونٹ گھس گیا، اور وہاں کچھ نقصان کر دیا تو عرب کی مشہور جنگ حرب بسوس مسلسل سو برس جاری رہی، ہزاروں انسانوں کا خون ہوا، عورتوں کو انسانی حقوق دینا تو کجا زندہ رہنے کی اجازت نہیں دی جاتی، کہیں بچپن ہی میں ان کو زندہ درگور کر دینے کی رسم تھی، کہیں مردہ شوہروں کے ساتھ ستی کر کے جلا ڈالنے کا رواج تھا، اس کے بالمقابل دوسری طرف یہ سفیہانہ رحم دلی کہ کیڑے مکوڑوں کی ہتھیا کو حرام سمجھیں، جانوروں کے ذبیحہ کو حرام قرار دیں، خدا کے حلال کئے ہوئے جانوروں کے گوشت وپوست سے نفع اٹھانے کو ظلم سمجھیں۔ امت محمدیہ اور اس کی شریعت نے ان سب بے اعتدالیوں کا خاتمہ کیا، ایک طرف انسان کو انسان کی حفاظت سکھلائی، عورتوں کو مردوں کی طرح حقوق عطا فرمائے، اور دوسری طرف ہر چیز کی حد مقرر فرمائی، جس سے آگے بڑھنے اور پیچھے رہنے کو جرم قرار دیا، اور اپنے حقوق کے معاملہ میں درگذر اور عفو وچشم پوشی کا سبق سکھلایا، دوسروں کے حقوق کا پورا اہتمام کرنے کے آداب سکھلائے۔

اقتصادی اور مالی اعتدال:

اس کے بعد دنیا کی ہر قوم وملت میں سب سے اہم مسئلہ معاشیات اور اقتصادیات کا ہے، اس میں بھی دوسری قوموں اور امتوں میں طرح طرح کی بے اعتدالیاں نظر آئیں گی، ایک طرف نظامِ سرمایہ داری ہے جس میں حلال وحرام کی قیود سے اور دوسرے لوگوں کی خوش حالی یا بدحالی سے آنکھیں بند کر کے زیادہ سے زیادہ دولت جمع کر لینا سب سے بڑی انسانی فضیلت سمجھی جاتی ہے، تو دوسری طرف شخصی اور انفرادی ملکیت ہی کو سرے سے جرم قرار دیا جاتا ہے، اور غور کرنے سے دونوں اقتصادی نظاموں کا حاصل مال ودولت کی پرستش اور اس کو مقصدِ زندگی سمجھنا اور اس کے لئے دوڑ دھوپ ہے۔

امت محمدیہ اور اس کی شریعت نے اس میں بھی اعتدال کی عجیب وغریب صورت پیدا کی، کہ ایک طرف تو دولت کو مقصد زندگی بنانے سے منع فرمایا، اور انسانی عزت وشرافت یا کسی منصب وعہدہ کا مدار اس پر نہیں رکھا، اور دوسری طرف تقسیم دولت کے ایسے پاکیزہ اصول مقرر کئے جن سے کوئی انسان ضروریاتِ زندگی سے محروم نہ رہے، اور کوئی فرد ساری دولت کو نہ سمیٹ لے، قابل اشتراک چیزوں کو مشترک اور وقفِ عام رکھا، مخصوص چیزوں میں انفرادی ملکیت کا مکمل احترام کیا، حلال مال کی فضیلت، اس کے رکھنے اور استعمال کرنے کے صحیح طریقے بتلائے، اس کی تفصیل اس قدر طویل ہے کہ ایک مستقل بیان چاہتی ہے، اس وقت بطور مثال چند نمونے اعتدال اور بے اعتدالی کے پیش کرنے تھے، اس کے لئے اتنا ہی کافی ہے جس سے آیت مذکورہ کا مضمون واضح ہو گیا کہ امت محمدیہ کو ایک معتدل اور بہترین امت بنایا گیا ہے۔

☆☆☆

❑ فقہی مقالات　　(دوسری اور آخری قسط)

سرکاری اسکیموں سے استفادہ اور حکم شریعت

مولانا محمد قمر الزماں ندوی
maeducationalsociety@gmail.com

واسطہ بننے والوں کا حاصل شدہ رقم میں فیصد یا حصہ طے کر کے لینے کا حکم:

واسطہ بننے والوں کا حاصل شدہ رقم میں فیصد یا حصہ طے کرنا اوراس کا لینا از روئے شرع جائز اور درست نہیں ہے، کیوں کہ جس طرح سود پر قرض لینا دینا ناجائز اور حرام ہے، اسی طرح سودی قرض کے لین دین میں واسطہ اور معاون بننا بھی جائز نہیں، ظاہر ہے کہ قرض دلانے کے لئے جو شخص واسطہ اور ذریعہ بن رہا ہے، وہ سودی کاروبار میں اور ناجائز کام میں معاون بن رہا ہے، اور گو اس کو کمیشن یا اجرت اصل رقم میں سے ملے، لیکن بہر حال یہ اس تعاون ہی کا اجر وصلہ ہے، لہذا اس معاملہ میں معاون بننا اور اس کی اجرت لینا یا حاصل شدہ رقم میں فیصد یا حصہ طے کر کے اس کا لینا یہ تمام صورتیں بھی ناجائز اور نادرست ہیں۔ قرآن مجید میں اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے:"ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان" (مائدہ:۳)
دوسری جگہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا و لا تأکلوا اموالکم بینکم بالباطل اور حدیث شریف میں سودی کاروبار میں ذریعہ اور واسطہ بننے والوں کو ملعون قرار دیا گیا ہے خواہ گواہ کی شکل میں ہو یا کتابت کرنے والا ہو، سود دینے والا ہو یا لینے والا ہو بلکہ حدیث کے مفہوم کے مطابق اس میں کسی طرح کا ذریعہ بننے والا ہو۔

البتہ غیر سودی کاروبار اور تجارت کے بارے میں فقہاء نے دلالی کی اجرت کے سلسلے میں لکھا ہے کہ یہ فی نفسہ مباح ہے اور اپنی محنت اور کام کے موافق پہلے سے مناسب اجرت طے کر لے تو طے کردہ اجرت لے سکتا ہے، فتاویٰ دارالعلوم میں ہے ”دلال کی اجرت کام اور محنت کے موافق لینا اور دینا جائز ہے بشرطیکہ کہ ظاہر کر کے رضا سے لیا جائے، اور جو خفیہ طرفین سے لیا جاتا ہے وہ جائز نہیں۔“ (فتاویٰ دارالعلوم قدیم ص ۱۱۹، ج ۷/ ۸، بحوالہ فتاویٰ رحیمیہ جلد ۹)۔

لہذا جن صورتوں میں حکومت عوام الناس کی مدد کرتی ہے اور ان رقم میں سے کسی حصہ کی واپسی نہیں ہوتی اور حکومت کی طرف سے اپنے شہریوں کی اعانت ہوتی ہے ان صورتوں میں واسطہ بننے والوں کا مطلوبہ محنتانہ لینا جائز معلوم ہوتا ہے۔ لیکن جن صورتوں میں حکومت عوام الناس کو سودی قرض دیتی ہے اور پورا معاملہ سودی ہوتا ہے ان صورتوں میں واسطہ بننے والوں مطلوبہ کا محنتانہ لینا درست معلوم نہیں ہوتا اور نہ ہی حاصل شدہ رقم میں فیصد یا حصہ طے کر کے لینا درست اور جائز معلوم ہوتا ہے۔

اور جن صورتوں میں واسطہ بن کر محنتانہ لینا درست ہے وہاں بھی شرط یہ ہے کہ وہ اپنی محنت اور کام کے مطابق لے، پہلے سے اجرت طے کر دی جائے تا کہ بعد میں کوئی نزاع کی صورت پیدا نہ ہو۔

امدادی رقم اور قرضوں کے لئے اگر رشوت دینا پڑے تو اس کا کیا حکم ہوگا؟

امدادی رقم اور سرکاری قرضوں کے حصول میں اگر رشوت دینی پڑے اور رشوت کے بغیر ان قرضوں کا حصول بالکل ممکن نہ ہو تو

مجبوری کی صورت میں رشوت دے سکتے ہیں۔ رشوت دینا تو اصلا گناہ اور ناجائز ہے، اس لئے جہاں تک ممکن ہو اس سے بچنے کی کوشش کی جائے۔ لیکن اگر اس کے سوا کوئی اور چارہ کار نہ ہو تو اس مقصد کے لئے رشوت دینے کی گنجائش ہے، یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ رشوت لینا تو ''حرام لعینہ'' ہے اور رشوت دینا ''حرام لغیرہ'' ہے اسی وجہ سے فقہاء نے دفع ظلم یا اپنے جائز حق کی وصولی کے لئے رشوت دینے کی اجازت دی ہے، مولانا ظفر احمد عثمانیؒ نے اس پر تفصیل سے گفتگو کی ہے، فرماتے ہیں:

"الرشوة ما يعطى لابطال حق أو لاحقاق باطل أما إذا أعطى ليتوصل به إلى حق أو ليدفع به عن نفسه ظلما فلا بأس به" (إعلاء السنن:۱۵/۵۰)

رشوت کی تعریف کرتے ہوئے فقہاء نے لکھا ہے کہ رشوت وہ مال ہے جو کسی دوسرے کو نقصان پہنچانے یا حق شرعی کے بغیر کوئی چیز حاصل کرنے کی غرض سے دی جائے۔ **"ما يعطى لابطال حق أو لاحقاق باطل"** (کتاب التعریفات للجرجانی، ص۱۴۸)۔

اس تعریف کی روشنی میں حکومت کے ملازمین اور کارکنان سے ناروا فائدہ اٹھانے کے لئے ان کو رشوت دینا قطعی حرام ہے لیکن اگر اپنے جائز حقوق بھی آپ ان کو رشوت دیئے بغیر نہ حاصل کرسکیں اور ان کا نقصان بھی آپ کے لئے قابل برداشت نہ ہو۔ نیز اس قسم کے رشوت خور ملازموں کی شکایت ان کے افسروں سے کرنے کا بھی موقع نہ ہو یا اس سے کوئی نتیجہ نکلنے کی توقع نہ ہو تو مجبوراً ان کو رشوت دے سکتے ہیں۔ لیکن ہمیشہ ان کو نصیحت کرتے رہنا چاہیے کہ یہ حرام خوری ہے، یہ انسانی شرافت اور مروت کے خلاف ہے۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی اپنی کتاب حلال وحرام میں تحریر فرماتے ہیں:

''شریعت میں کمائی کے جن طریقوں کی سخت مذمت کی گئی ہے ان میں ایک رشوت بھی ہے، رشوت کا لینا اور دینا دونوں حرام ہے، ایک حدیث میں تو آپؐ نے ان دونوں پر اپنی زبان مبارک سے لعنت بھیجی ہے۔ رشوت ظلم نہ کرنے کے لئے حاصل کی جانے والی رقم بھی ہے اور جائز حق دینے پر لی جانے والی رقم بھی، لینا تو بہر طور حرام ہے، البتہ اپنی جان ومال، عزت وآبرو کے تحفظ اور انصاف اور جائز حق کے حصول کے لیے رشوت دینے کی گنجائش ہے۔ اسی طرح کسی دشمنِ اسلام کے شر سے حفاظت کے لئے اس کو رشوت دی جائے یہ بھی جائز ہے جیسا کہ خود حضورؐ مفسد شعراء کی زبان بندی کے لیے دیا کرتے تھے''۔ (حلال وحرام، ص۳۷۵)۔

خلاصہ یہ کہ رشوت تو فی نفسہ قطعی حرام ہے، خدا اور رسولؐ نے راشی اور مرتشی دونوں پر لعنت کی ہے اور اس پر دوزخ کی وعید سنائی ہے۔ لیکن اضطرار کی حالت میں مردار کی بھی اجازت دی گئی ہے کچھ یہی نوعیت رشوت دینے کی ہے، فقہاء نے لکھا ہے کہ دفع مضرت کے لیے رشوت دی جائے تو امید ہے کہ اللہ تعالیٰ مواخذہ نہیں فرمائیں گے۔

من مانا محنتانہ لینا یا مجبور کر کے حاصل شدہ رقم میں فیصد یا حصہ طے کر کے اپنا محنتانہ لینا از روئے شرع بہتر اور پسندیدہ نہیں ہے بلکہ یہ صورت کراہت کی ہوگی۔ اس مسئلہ کو نفع کے تناسب والے مسئلہ پر بھی قیاس کیا جاسکتا ہے کہ انسان اپنے مال میں کتنا فیصد نفع لے سکتا ہے؟

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی مدظلہ العالی لکھتے ہیں:

''شریعت میں نفع کے لئے کوئی تناسب متعین نہیں کیا گیا ہے، بلکہ یہ تاجرین کے عرف ورواج اور فریقین کی باہمی رضامندی پر موقوف ہے، البتہ فقہاء نے لکھا ہے کہ اتنا نفع لینا جو غبن فاحش کے دائرہ میں آجائے مکروہ ہے، غبن فاحش سے مراد یہ ہے کہ کسی چیز کی بازار میں زادہ سے زیادہ سے جو قیمت لگائی جاتی ہو اس سے بھی زیادہ قیمت لی جائے، جیسے ایک چیز پچاس سے پچھتر روپیہ میں فروخت کی جاتی ہو، اب کوئی شخص اسے اسّی روپیہ میں فروخت کرتا

ہے، تو یہ غبن فاحش ہے، خرید وفروخت درست ہو جائے گی، نفع بھی تاجر کے لئے حلال ہوگا، لیکن اس کا یہ عمل مکروہ ہوگا اور اگر خریدار نے یقین دہانی کرائی ہو کہ میں نے مناسب قیمت لگائی ہے تو ایسی صورت میں اس کو اس معاملے کے ختم کردینے کا حق بھی حاصل ہوگا''۔ (کتاب الفتاویٰ: ۵/۲۱۱)۔

شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے خوب لکھا ہے کہ ''تاجرانہ نفع کی دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ محتاج کی ضرورت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اسے خوب گراں بیچا جائے، دوسرے یہ کہ معمولی نفع لیا جائے اور جلد جلد اس کو استعمال میں لایا جائے، نفع کی یہ دوسری شکل تمدنی تقاضوں کے مطابق بھی ہے اور برکت کا باعث بھی''۔ (حجۃ اللہ البالغۃ: ۲/۲۷۱)۔

ایک قابل غور پہلو: ایک مسلمان کے لئے سودی معاملات، سودی لین دین اور سودی کاروبار میں واسطہ بن کر اپنا محنتانہ لینا اور اسی کو اپنا ذریعہ معاش بنانا از روئے شرع جائز نہیں ہے، وقتی طور پر جب تک کہ دوسرا ذریعہ معاش نہ مل جائے اس سے اپنی ضرورت پوری کرسکتا ہے، لیکن دوسرا ذریعہ معاش تلاش کرنا جو جائز وحلال ہو اس کی ذمہ داری ہے۔ اس مسئلہ کو بینک کی ملازمت پر قیاس کیا جاسکتا ہے۔ مولانا خالد سیف اللہ رحمانی مدظلہ العالی لکھتے ہیں:

''بینک کے کاروبار سود پر مبنی ہیں اور سودی کاروبار حرام ہے، رسول اللہ ﷺ نے سود لینے والے، دینے والے، لکھنے والے، اس کے گواہان اور اس کا واسطہ بننے والے سب پر لعنت فرمائی ہے اس لئے کہ یہ تمام لوگ سودی کاروبار میں تعاون کررہے ہیں، بینک کے وہ ملازمین جو حساب وکتاب، نوشت وخواند اور لین دین کا کام کرتے ہیں اس گروہ میں داخل ہیں اور معصیت میں براہ راست معاون ہیں، اس لئے یہ ملازمت ان کے لئے جائز نہیں ہے۔ البتہ نیچے درجہ کی ملازمت (مثلاً جاروب کش، چوکیدار، وغیرہ جن کا کاروبار اور معاملات سے تعلق نہیں نفسِ عمارت کی حفاظت وغیرہ پر مامور ہیں) جائز ہے''۔

امدادی رقوم یا قرض حاصل کرنے کے لئے غلط بیانی سے کام لینے کا شرعی حکم:

امدادی رقوم یا قرض حاصل کرنے کے لیے اگر حکومت وقت نے کچھ شرائط ومعیارات متعین کئے ہوں تو کسی شخص کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ دجل وفریب اور غلط بیانی سے کام لے اور دھوکہ دے کر غلط طریقہ پر امداد یا قرض سے فائدہ اٹھائے، قرآن و حدیث میں اس کی صریح ممانعت آئی ہے کہ آدمی جھوٹ بول کر یا دھوکہ دے کر کسی چیز کو حاصل کرے، اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا"من غش فلیس منا" جو دھوکہ دے وہ ہم میں نہیں ہے۔ اہل ایمان کو چاہیے کہ وہ اس سلسلے میں محتاط رہیں اور برادران وطن کے لئے ایک نمونہ بنیں۔

خاص کر ہم مسلمانوں کو تو قطعا یہ زیب نہیں دیتا کہ ہم کسب معاش کی حرص میں ایسی نازیبا حرکتیں کریں، اس سے آخرت میں جو گناہ ہوگا وہ تو ہوگا ہی، دنیا میں بھی بے برکتی پیدا ہوتی، اور انسان آفتوں اور بلاؤں سے دوچار ہوتا ہے۔

مفتی احمد خانپوری مدظلہ العالی ایک استفتاء کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

''یہ ایک طرح کی دھوکہ بازی ہے کہ اپنی آمدنی کم بتلا کر ناحق طریقہ سے اپنے آپ کو مستحق امداد ثابت کیا جائے، یہ حرام ہے، مزید برآں اپنے اس فریب اور دھوکہ بازی کو درست ظاہر کرنے کے لئے رشوت کا بھی ارتکاب کیا جارہا ہے، وہ بھی حرام ہے''۔ (محمود الفتاویٰ جلد چہارم، ص۸۰۳-۸۰۴)۔

حکومتِ وقت نے جو شرائط ومعیارات امدادی رقوم یا قرض حاصل کرنے کے متعین کئے ہیں اس میں فراڈ اور دجل وفریب سے کام لے کر یا جعلی سارٹیفکٹ بنوا کر حکومت سے رقم لینا یہ ایک طرح سے میری نظر میں لوٹ کھسوٹ کے درجہ میں ہے اور کسی شخص کے

لئے یہ جائز نہیں کہ وہ لوٹ کھسوٹ کر مال حاصل کرے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا: "من انتهب حبة فليس منا" (ترمذی شریف، ۱/۲۸۹)

الغرض جھوٹ اور غلط بیانی کرکے امدادی رقوم یا قرض حاصل کرنا ازروئے شرع ناجائز اور حرام ہے اور جھوٹ دغابازی اور فریب پر جتنی وعیدیں آئی ہیں، ایسا شخص ان کا مستحق ہے، مثلاً جھوٹوں پر اللہ کی لعنت۔ ارشاد نبوی ﷺ ہے کہ دھوکہ کرنے والا ہم میں سے نہیں ہے۔ اس لئے جعل سازی اور غلط بیانی کرکے امدادی رقوم یا قرض حاصل کرنا ازروئے شرع جائز نہیں ہوگا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

اگر مقروض کی طرف سے سود حکومت ادا کرے تو کیا حکم ہوگا؟

حکومتِ وقت بعض اسکیموں میں تعلیم یا کسی اور مقصد کے بینک سے پبلک کو قرض دلاتی ہے اور اس پر بینک کا جو سود ہوتا ہے وہ حکومت مقروض کی طرف سے خود ادا کرتی ہے خود مقروض کو ادا نہیں کرنا پڑتا یا بعض صورتوں میں اس کا بڑا حصہ حکومت ادا کرتی ہے اور معمولی سا حصہ خود مقروض کو ادا کرنا ہوتا ہے، یہ اسکیم اور اس سے استفادہ از روئے شرع جائز نہیں ہے کیوں کہ یہ معاملہ بھی خالص سودی معاملہ ہے کیوں کہ جس طرح عام حالت میں سودی قرض لینا جائز نہیں ہے اسی طرح یہ بھی جائز نہیں ہے کہ کوئی فرد یا ادارہ یا حکومت کسی مقروض کا کفیل اور وکیل بن جائے اور قرض خواہ کی طرف سے وہ سود ادا کرے، جس طرح سودی قرض لینا جائز نہیں ہے اسی طرح کسی کو اپنی کفالت اور ضمانت سے سودی قرض دلانا بھی جائز نہیں ہے۔ دوسری بات یہاں یہ بھی ذہن میں رہے کہ جس طرح زیادہ رقم کا سودی کاروبار اور لین دین جائز نہیں اسی طرح معمولی سودی لین دین بھی جائز نہیں۔ سود چاہے کم دینا پڑے یا زیادہ حرام دونوں ہیں۔

شریعت کی نظر میں جس طرح چوری ناجائز ہے اور چوری کا مال حرام ہے اسی طرح اگر کوئی دوسرا شخص یا ادارہ چوری کرکے کسی کو دے تو اس صورت میں بھی وہ مال حرام ہی ہوگا اور اس کا لینا جائز نہیں ہوگا، صورتِ مسئلہ میں بھی چاہے مقروض خود سود ادا کرے یا اس کی طرف سے حکومت ادا کرے دونوں صورتیں ناجائز ہیں۔

البتہ محتاج اور ضرورت مند مسلمان جو واقعی ان سرکاری اسکیموں سے فائدہ اٹھانے کے محتاج ہیں اور ان کے پاس بینک کا انٹرسٹ بھرنے کا روپیہ نہیں ہے ان کے لئے سہولت اور گنجائش ہے کہ وہ ان اسکیموں سے فائدہ اٹھائیں جن میں مقروض کی طرف سے سود حکومت ادا کرتی ہے، البتہ خوش حال مسلمانوں کے لئے محض عیش وعشرت کی زیادتی اور تجارت کے فروغ کے لئے اس طرح کا سودی قرض لینا جائز نہ ہوگا۔ مولانا خالد سیف اللہ رحمانی کی ایک چشم کشا تحریر پیش خدمت ہے جس سے اس مسئلہ کو سمجھنا آسان ہوگا۔ مولانا تحریر فرماتے ہیں:

''ہندوستان جیسے ملک میں جہاں زمام اقتدار ہمارے ہاتھوں میں نہیں ہے اور خصوصیت سے معاشی نظام کی تشکیل اور قانون سازی میں اقلیت یا اکثریت کے مذہبی اصول کی رعایت کئے جانے کی کوئی ضمانت دستور میں نہیں دی گئی ہے، ضروری ہوگا کہ احکام پر غور کرتے ہوئے ہم شارع کی ان ہدایات اور فقہاء کے ان اصول و اجتہادات کو سامنے رکھیں اور معاملہ کے دونوں پہلوؤں کو سامنے رکھ کر فیصلہ کریں، اس پہلو کو بھی کہ حرج اور مشقت سے بچانا شریعت کے بنیادی مقاصد میں سے ہے، اور اس بات کو بھی مدنظر رکھا جائے کہ شارع کی صریح محرمات کے دروازہ پر دستک دینے سے بچا جائے''۔ (کتاب الفتاویٰ: ج۵، ص۲۳۳)۔

حکومت کا اپنے محفوظ سودی فنڈ سے افراد و اشخاص کے تعاون کا شرعی حکم:

حکومت وقت کے یہاں بعض اسکیمیں ایسی بھی ہیں، جن

میں حکومت نے ایک محفوظ فنڈ قائم کردیا ہے، حکومت نے اس رقم کو بینک میں ڈپازٹ کردیا ہے اور حکومت کو اس کے انٹرسٹ سے جو رقم حاصل ہوتی ہے اسی سے تعلیمی و رفاہی اداروں اور افراد و اشخاص کا تعاون کیا جاتا ہے، گویا حکومت براہ راست یا حکومت کا ادارہ انٹرسٹ وصول کرتا ہے، اس کا مالک ہوتا ہے اور پھر وہ اسکیم سے استفادہ کرنے والے حضرات کی مدد کرتا ہے، صورت مسئلہ میں ظاہر سی بات ہے کہ حکومت خالص سود کے پیسے اور روپے سے تعلیمی و رفاہی اداروں اور افراد و اشخاص کی مدد کرتی ہے اس لئے اس اسکیم سے صاحب حیثیت مسلمانوں کا استفادہ کرنا از روئے شرع درست اور جائز نہیں ہوگا، البتہ جو مسلمان محتاج و نادار ہیں نان شبینہ کے بھی محتاج ہیں اس اسکیم سے فائدہ نہ اٹھانے سے ان کو مالی اور معاشی دشواری کا سامنا کرنا یقینی ہو تو ایسے مسلمانوں کو اس اسکیم سے فائدہ اٹھانے کی اجازت ہوگی کیوں وہ محتاج اور ضرورت مند ہیں، البتہ غریب اور محتاج مسلمانوں کے لئے بھی سعادت مندی کی بات یہی ہے کہ اگر وہ صحت مند ہیں اور ان کے قویٰ مضبوط ہیں جسم میں طاقت وقوت ہے تو ایسی سودی رقم اور سودی اسکیم کے حصول سے پرہیز کرکے رزقِ حلال کی طلب میں رہیں، حلال اور پاکیزہ روزی پیٹ میں جاتی ہے تو اس سے قلب منور ہوتا ہے، اعمالِ صالحہ کی توفیق ہوتی ہے عبادات میں دل لگتا ہے اور جب حرام ومشتبہ روزی پیٹ میں جاتی ہے تو قلب میں ظلمت و وحشت پیدا ہوتی ہے، عبادات میں دل نہیں لگتا، نیک کاموں کی توفیق نہیں ہوتی نیز حلال رزق میں برکت ہوتی ہے، اس لئے ایک مسلمان کو مشتبہ مال سے بہرحال اجتناب کرنا چاہیے۔ اقبال مرحوم نے امت کو یہی پیغام دیا تھا:

اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

حکومت کے محفوظ سودی فنڈ سے مسلمانوں کی مدد واعانت کے شرعی حکم کے سلسلے میں احقر کا موقف وہی ہے جس کا اظہار اوپر کی سطروں میں کیا گیا ہے، لیکن ہندوستان میں مسلمانوں کے موجودہ حالات، حکومت کے ساتھ ان کا رویہ، برادران وطن کا سلوک اور معاشی اعتبار سے مسلمانوں کو قلاش بنانے کی نت نئی سازشیں ان تمام چیزوں اور پہلوؤں کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ ہندوستان کے موجودہ حالات میں جہاں ہندو مسلم فسادات کی کثرت ہے اور ان فسادات کا اتفاقاً پیش نہ آنا بلکہ بعض جماعتوں اور تحریکوں کی طرف سے مسلمانوں کی جان و املاک کی ہلاکت و بربادی کی منظّم پلاننگ ہونا یہ حالت موجودہ ہندوستانی مسلمانوں کا ایسے فنڈ سے اعانت اور مدد لینا جائز ہونا چاہیے، جیسا کہ ہمارے اکابرین نے ہندستان کے مخصوص فرقہ وارانہ فسادات کی بنا پر انشورنش کی اجازت دی ہے باوجود اس کے کہ انشورنس کی تمام شکلوں میں ربوا اور جوا موجود ہے۔

ایک کلمہ گو کے لئے ضروری ہے کہ وہ ہر حال میں ان تمام اسکیموں سے فائدہ اٹھانے میں احتیاط کرے جو سودی اور ربوی ہوں اور بغیر شرعی ضرورت اور حاجت کے اس کو اپنے اوپر حرام سمجھے لیکن جہاں مسلمانوں کے جان و مال کو نقصان ہو اس نقصان کی بھرپائی اگر حکومت ان اسکیموں سے کرتی ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں، اسی طرح محتاج اور انتہائی مجبور مسلمان بھی اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

☆☆☆

❑ نقطۂ نظر

شاہ سلمان اکیڈمی برائے حدیث کا قیام

(کیا اس کے پیچھے سیاسی مقاصد ہیں)

تحریر: بسام ناصر
http//m.arabi21.com

ترجمہ: محمد شعیب ندوی
ریسرچ اسکالر، ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی، علی گڑھ

عالم اسلام خاص کر زمین حرم پوری ملت اسلامیہ کا دھڑکتا دل ہے۔ وہ دنیائے اسلام کا مرکز ہے، کیوں کہ وہاں سے ایک انقلابی ذات دائمی وابدی قانون لے کر اور دنیا کے لئے نجات دہندہ بن کر رونما ہوئی۔ جب تک عالم اسلام اور مسلمانوں نے اس انقلابی پیغام پر صحیح سے عمل کیا، وہ دنیا میں سرخ رو رہے، کامیابی نے ان کے قدم چومے، دنیا ان کے سامنے ناک رگڑتی ہوئی آئی، لیکن جب سے عالم اسلام طاغوتی و استعماری طاقتوں کے منصوبوں اور فسادی کاروائیوں سے دو چار ہوا ہے تب سے وہ پستی و ذلت کے انتہائی گہرے قعر میں پھنسا ہوا ہے۔ پورا عالم اسلام خاص طور سے سعودیہ عربیہ مغرب کی لائی ہوئی جمہوریت اور اس کے سیکولرزم میں ایسا جکڑا ہوا ہے کہ اپنی سیاسی بساط کو باقی رکھنے کے لئے کل تک جن علماء وصلحاء اور مفکرین و دانشوران کو مصلح قوم کے اعزاز سے نوازتا تھا، آج انہی کو دہشت گرد اور انتہا پسند قرار دے رہا ہے، اس نے بے شمار علماء کو پس زنداں ڈال دیا ہے، اور ان پر طرح طرح کے مظالم روا رکھے ہوئے ہے۔ یہ سب وہ اپنے رفیق امریکہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے کر رہا ہے۔ حد تو یہاں تک ہوگئی ہے کہ اپنے رفیق کی رضا حاصل کرنے، اپنی تن آسانی، عافیت کوشی، راحت طلبی، اور عیش پرستی کو باقی رکھنے کے لئے مملکت عربیہ سعودیہ نے اس انقلابی ذات یعنی رسول اکرم ﷺ کے پیغام اور آپ کی بیاں کردہ تشریحات وتوضیحات کو ہی نشانہ بنا لیا ہے، چنانچہ کچھ دن قبل عالمی حدیث نبوی ﷺ اکیڈمی کے قیام کا اعلان کیا گیا۔

سعودی عرب کے سرکاری اور عوامی حلقوں کی طرف سے اس اقدام کی بڑی تحسین وستائش کی گئی، اسے پوری ملت اسلامیہ کے لئے ایک خوش آئند قدم قرار دیا گیا اور کہا گیا کہ یہ فیصلہ خادم الحرمین کے حدیث سے شغف اور لگاؤ کا آئینہ دار ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ سنت نبوی پر ان کی خاص توجہ ہے۔ اور ایسا کیوں نہ ہو کہ اسلام میں حدیث کا مقام ومرتبہ بہت اونچا ہے۔

شاہی فرمان کے مطابق اس اکیڈمی کے قیام کا سبب یہ ہے کہ حدیث نبوی کو تمام عالم کے مسلمانوں کے نزدیک بہت عظمت و منزلت اور تقدس کا درجہ حاصل ہے، اس کی حیثیت اسلام کے مصدر ثانی کی ہے، حکومت کا یہ اقدام ان خدمات کا تسلسل اور امتداد ہے، جو سعودی حکومت ہمیشہ سے شریعت اسلامی اور اس کے مصادر و مآخذ کی جمع و تدوین اور تصنیف و تحقیق کے ذریعہ سنت نبویہ کی حفاظت کے میدان میں پیش کرتی رہی ہے۔

حدیث اور علوم حدیث کے ماہرین ایسی کسی اکیڈمی کے قیام کے متعلق اپنی خواہشات اور آرزووں کا اظہار کرتے رہے ہیں، جو

حدیث نبوی ﷺ کی سائنٹفک انداز میں خدمت کرے، اور جو ایک علمی و تحقیقی منصوبے کے ساتھ کام کرے، جس کی سرپرستی ایسے علماء و اساتذہ اور ماہرین حدیث کریں جن کو حدیث اور علوم حدیث کے ساتھ مختلف علوم وفنون میں یدطولی حاصل ہو۔

بین الاقوامی حدیث نبوی ﷺ اکیڈمی، دبئی کے معاون جنرل سکریٹری ڈاکٹر عبدالسلام ابوسمحہ نے کہا ہے کہ کسی ایسی تحقیقی اکیڈمی کا خیال، جو حدیث نبوی کا خصوصی مطالعہ کرے، کوئی نیا خیال نہیں ہے، بلکہ گذشتہ تین سال سے زائد سے یہ خیال بہت سی اکیڈمیوں، حدیث اور علوم حدیث کے اسکالرس کا مرکز توجہ رہا ہے، اور وہ اس بابت سوچتے رہے ہیں۔

انھوں نے مزید کہا: ہم نے اس سلسلے میں سعودی، یمن اور مصر کے معزز ارباب فکر ونظر کے ساتھ تبادلہ خیال بھی کیا تھا۔ بہرحال اسلامک فقہ اکیڈمی کے طرز پر اس حدیث نبوی اکیڈمی کے قیام سے حدیث اور علوم حدیث کے بہت سے متخصصین کی ایک بڑی آرزو پوری ہوئی ہے۔

اس منصوبہ کی ابتدا کے متعلق ڈاکٹر ابوسمحہ بیان کرتے ہیں کہ وہ اور ڈاکٹر عبدالجبار مرانی یمنی ایک زمانے سے ایسی اکیڈمی کے قیام کا منصوبہ بنائے ہوئے تھے اور اس کی تکمیل کے لئے انھوں نے ذمہ داروں کو ابھارا بھی تھا، بلکہ اس خیال کا اظہار شاہ عبداللہ مرحوم کے دور میں ہی کیا گیا تھا، اور ڈاکٹر عبدالجبار مرانی نے تو، جو کہ سعودیہ میں مقیم ہیں، اس منصوبہ کے متعلق اپنی رائے لکھ کر بہت سے سعودی علماء کے سامنے اسے پیش بھی کیا تھا، لیکن اس وقت ہمارا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا۔ موصوف نے اس بات کو بھی اہم قرار دیا کہ اس منوصبہ کی سرپرستی سعودی حکومت نے قبول کی، اور اب یہ منصوبہ شاہ سلمان کے عہد میں تکمیل کو پہنچا، جنھوں نے ابھی کچھ دن پہلے اس کے قیام کا حکم دیا ہے۔

ڈاکٹر ابوسمحہ نے اس بات کی سخت تنقید کی اور اسے سطحیت سے تعبیر کیا، جو اکیڈمی کے اسباب ومحرکات اور اغراض ومقاصد کے تئیں خطرات وشبہات کا اظہار کیا جارہا ہے، اور بعض لوگ اس شبہہ کا اظہار کررہے ہیں کہ اس اکیڈمی کے قیام کے پیچھے سعودی حکومت کے سیاسی مقاصد کارفرما ہیں۔

انہوں نے کہا کہ حدیث نبوی سے کھلواڑ اور اس کی حیثیت کو ختم کرنے کے جو خطرات وشبہات ظاہر کئے جارہے ہیں، وہ بہت بعید ہیں، اس لئے کہ حدیث کی کتابیں محفوظ ومدون ہیں اور علوم حدیث ثابت وپختہ ہیں، وہ اتنے کمزور نہیں جو ایسے کسی طریقے سے ہل جائیں۔

انھوں نے مزید کہا کہ اس بات کی توقع ہے کہ اکیڈمی اپنے مقاصد میں اس بات کو شامل کرے کو وہ متشدد اور تکفیری جماعتوں کے ان استدلالات کا مناقشہ ومحاکمہ کرے، جو وہ اپنے تصورات وخیالات ثابت کرنے کے لئے احادیث سے پیش کرتے ہیں، اور ان دلائل کے ہلکے پن کو واضح کرے، ان میں موجود غلطیوں کی نشاندہی کرے اور یہ ثابت کرے کہ ان احادیث سے جو استدلال کیا جارہا ہے، وہ صحیح نہیں ہے۔

اکیڈمی کیا کام کرے گی؟ اس سوال کے جواب میں ابوسمحہ نے کہا: یہ اکیڈمی مختلف میدانوں میں کام کرے گی: اولاً: حدیث کے ماہرین ومتخصصین ذخیرۂ حدیث کی تحقیق وتنقیح کا کام کریں گے۔ ممکن ہے کہ اس طرح سے احادیث کی تحقیق وتخریج میں قدامت پرستی بھی حائل ہو، لیکن اس طرف قطعاً توجہ نہ کی جائے گی۔

دوم: احادیث کی ان متداول شروحات کی مراجعت کی جائے گی، جنھیں انتہا پسند اور متشدد تحریکیں اپنے اغراض ومقاصد کے لئے

استعمال کرتی ہے، اور ان کا وہ صحیح مفہوم بیان کیا جائے گا، جس کا ہمارے ائمہ سابقین کے مقرر کردہ اصول وقواعد تقاضا کرتے ہیں۔

ان اہداف واغراض کے علاوہ اس اکیڈمی کے قیام کا سب سے اہم اور بنیادی مقصد یہ ہے کہ احادیث نبوی ﷺ پر وارد شکوک وشبہات اور اعتراضات کا مدلل ومعقول علمی جواب دیا جائے، مزید یہ کہ حدیث اور علوم حدیث کی خدمت کے لئے الیکٹرانک طرز اختیار کیا جائے۔

ان ہی اغراض کے پیش نظر مذہبی اسکالر ڈاکٹر عبدالجبار مرانی نے شاہ سلمان کے نام سے موسوم اس اکیڈمی کے قیام پر مبارک باد دی ہے، اور اسے ایک عظیم کام سے تعبیر کیا ہے، نیز اس کے قائم کرنے والوں کے لئے توفیق واستقامت کی دعا کی ہے۔

ڈاکٹر عبدالجبار سے جب اکیڈمی کے قیام کے مقاصد کے بارے میں سوال کیا گیا تو انھوں نے جواب دینے کے بجائے اس اعلان کا حوالہ دے دیا، جس میں اجمالی طور پر یہ بات کہی گئی ہے کہ ہر ممکنہ وسائل سے حدیث نبوی کی خدمت کی جائے گی۔

ایک طرف اکیڈمی کے منتظمین وقائمین اس کے اہداف ومقاصد کی تعریف کررہے ہیں، جب کہ دوسری طرف اس کے ناقدین اس کے بارے میں اپنے شکوک وشبہات کا اظہار کررہے ہیں، ان کیا خیال ہے کہ اکیڈمی کے مقاصد کچھ اور ہیں اور ظاہر کچھ اور کئے جارہے ہیں، ان کے مطابق اس اکیڈمی کے ذریعے امریکی مفادات وابستہ ہیں، اور اس کی مدد سے دراصل اس وہابی (جہادی) فکر کا خاتمہ مقصود ہے، جسے امریکی میڈیا متشدد اور انتہا پسند قرار دیتی ہے۔

شامی محقق ڈاکٹر عداب محمود حمش اپنے خیالات وتاثرات کا اظہار اس طرح کرتے ہیں کہ نظریہ وہابیہ نے - جس پر سعودی نظام قائم ہے- متشدد افکار ونظریات امام احمد کے مسلک کے.....اور ابن تیمیہ کی تحریروں سے اخذ کئے ہیں، جو دراصل مخالفین کے ردعمل میں لکھی گئی تھیں، یہی وجہ ہے کہ ہماری اسلامی تاریخ میں کوئی ایسا عالم نہیں ملتا، جس نے ''فإن تاب وإلا فيقتل'' اور اس جیسے کلمہ کو اس طرح استعمال کیا ہو، جیسے ابن تیمیہؒ نے استعمال کیا ہے۔ مزید انھوں نے اس بات کے ذکر کے بعد کہ تحریک وہابیت میں جو تشدد کا مزاج پایا جاتا ہے، وہی داعش اور اس جیسی متشدد تنظیموں کے وجود کا سبب ہے، آگے کہا: اس صورت حال میں شاہ سلمان اور ان کے ولی عہد کا اکیڈمی کے قیام اور حدیث اور اس کے مراجع کے متعلق تحقیق وتنقیح پر مبنی خدمات کی فکر کرنا دو احتمال سے خالی نہیں ہے:

پہلا احتمال یہ ہے کہ سعودی حکومت کا یہ قدم امریکی احکام وہ امر کی تکمیل کے لئے ہو، کیوں کہ آج پوری دنیا ان خونی درندوں کی آماجگاہ بنی ہوئی ہے۔ دیگر ممالک بھی اسی کے چٹے بٹے ہیں، جو اپنے آقا اور مقتدا امریکہ کی رضا وخوشنودی حاصل کرنے کے لئے ہر طریقہ سے کوشاں ہے، آج عالم اسلام میں اسلامی خلافت کے قیام کی نام نہاد تحریکیں وتنظیمیں، داعش القاعدہ، النصرہ وغیرہ کے افکار ونظریات شدت پسندی اور خالص وہابی فکر پر مبنی ہیں، جو کہ خود امریکہ کی پیداوار ہے۔ جس کا اہم مقصد یہ ہے کہ ان نظریات کو تحریک الاخوان المسلمین یا مسلمانوں کی معتدل دیگر تحریکات سے جوڑ کر اور ان پر دہشت گردی کا بے بنیاد الزام لگا کر بیخ کنی کرنے کی نہایت ہی خطرناک سازش ہے۔

دوسرا احتمال۔ یہ ہے کہ نئے ولی عہد کے سیکولرزم مشیرین و مقربین نے مشورہ دیا ہے کہ کتاب وسنت کی بنیاد پر قائم دینی اداروں کا خاتمہ اسی وقت ممکن ہے جبکہ حدیث نبویؐ پر نقد کے ذریعہ ان کی کمزوری واضمحلال کو ظاہر کیا جائے اس لئے کہ حدیث سے

ماخوذ طرز زندگی قرآن سے بعید تر ہے۔ اور وہ روایات کی پہلے تیسرے، ساتویں درجہ کی ثقافت ہے، جس پر تنقید کرنا اور اس کو بنیاد بنا کر تمام کتاب وسنت پر قائم دینی اداروں کا خاتمہ کرنا آسان ہے۔ اس کے علاوہ ان کے وجود کو مٹانے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ اسی وجہ سے اس اکیڈمی کا قیام عمل میں آیا ہے۔

موجودہ خاندانی بادشاہت کے متعلق اس طرح کے تجزیہ اور احتمالات کی صداقت کے شواہد و براہین مبنی برحق ہے، ان میں کسی شک و ریب کی گنجائش نہیں ہے، کیوں کہ نئے ولی عہد نے امر بالمعروف ونہی عن المنکر بورڈ کے بالمقابل دل جمعی، لطف اندوزی، اور نفس کی تسکین کے لئے رقص وغناوغیرہ بورڈ کی تشکیل دی ہے۔

سعودی ذرائع ابلاغ نے خبر دی ہے کہ حالیہ سعودی قومی دن پر منعقد ہونے والی تقاریب میں آزادانہ مرد وزن کا اختلاط اور رقص وغنا کھلم کھلا کیا گیا ہے۔

اس کے علاوہ مزید دینی اداروں کی وقعت، اور مقام ومرتبہ کم کرنے کے لئے مملکت عربیہ نے اپنے نئے منشور ومنصوبہ پر آل سعود کے ہی ایک نا اہل حدیث اور علوم حدیث سے بے بہرہ شیخ کو اس اکیڈمی کا سربراہ مقرر کیا ہے جبکہ سعودی میں تقوی واستقامت کے اعلیٰ معیار پر فائز بے شمار حدیث نبوی اور علوم حدیث کے ماہرین مصروف عمل ہیں، جن کے بارے میں خود غرضی، ضمیر فروشی، بدعہدی کا کسی بھی صورت میں شائبہ تک نہیں کیا جاسکتا۔

اسی اثناء میں اردن کے معتبر اسلامی اسکالر ڈاکٹر خالد جوابرہ نے بھی اپنے Facebook acount پر مجمع الملک سلمان للحدیث النبوی کے متعلق اپنے اپنے افکار و آراء اور دور اندیشی کا اظہار کرتے ہوئے بیان کیا کہ سعودی جن حالات وکوائف سے گزر رہا ہے، اس تشویشناک صورت حال میں اسی طرح کا پلان ومنصوبہ مستقبل میں بھیانک وخطرناک نتائج کا پیش خیمہ ہے۔

سعودی کے نائب جنرل سکریٹری سعود بن عبداللہ معجب نے واضح کیا کہ اس اکیڈمی کا مقصد ومطمح نظر ذات محبوب خدا ﷺ پر وارد ہونے والے جھوٹے الزامات و اعتراضات کا معقول علمی جواب دینا اور ان سے عوام کو متعارف کرانا ہے۔ تا کہ عوام کو صحیح معلومات سے واقفیت ہو، اور لغویات سے اجتناب کی راہ آسان ہو، اس موقع پر ڈاکٹر خالد جوابرہ سے سوال کیا گیا کہ نائب سکریٹری کا احادیث نبویہ سے کیا تعلق ہے؟ کے جواب میں انہوں نے کہا کہ اکیڈمی احادیث نبویہ ﷺ کی جو تشریحات وتوضیحات بیان کرے گی، ان سے مخالفت یا انحراف کرنے والوں کو اسلام کے نام پر خوف زدہ کرنے اور، دھمکانے کے لئے یہ اقدام کیا گیا ہے، کیوں کہ عرصہ دراز سے لے کر آج تک سعودی میں فکری تشدد، تنگ نظری، تعصب، پروان چڑھ رہا ہے، لیکن اب تک اس کے خاتمہ کے لئے کوئی لائحہ عمل نہیں تیار کیا گیا۔ اس اکیڈمی کے منفی مقاصد کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ شوشل میڈیا پر سرگرم رہنے والے حضرات نے وزارت ثقافت وسعودی ذرائع کے ریویو میں اس بات کی وضاحت بھی پائی ہے کہ مملکت عربیہ سعودیہ احادیث رسول اللہ ﷺ کی بیان کردہ تشریحات وتفاسیر کی نگرانی کرے گی، تا کہ ان کو تشدد، انتہا پسندی (جہاد) وغیرہ کے جواز میں نہ استعمال کیا جائے، یہی اس اکیڈمی کے قیام کے ضمنی مقاصد کے علاوہ سب سے بنیادی اور اہم مقصد ہے۔

☆☆☆

❏ تعلیم و تربیت

تربیت اولاد - چند اہم گوشے

تلخیص وترجمانی
ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

ذہانت کی نشونما:

مختلف اشیاء کے درمیان تعلق کو دیکھنے اور پھر مشکلات کو حل کرنے کے لیے ان تعلقات کو استعمال کرنے کی صلاحیت کو ذہانت سے تعبیر کیا جاتا ہے، ذہانت کی اگر چہ اور بھی تعریفات ہیں لیکن اگر اس تعریف کو پیش نظر رکھیے تو آپ دیکھیں گے کہ جب بھی آپ اپنے بچے کو مختلف چیزوں کے آپس میں تعلق کو دیکھنے اور سمجھنے کا موقع دیں گے، اسی طرح جب بھی آپ اس کو معلومات وتجربات سے فیض اٹھانے کا موقع فراہم کریں گے تو اس کی ان امور کو دیکھنے اور برتنے کی ذاتی صلاحیت میں آپ اضافہ ہوتا ہوا دیکھیں گے، آگے ہم اس طرح کے بعض عملی طریقوں کا ذکر کریں گے جن سے اس صلاحیت کے نمو میں مدد ملتی ہے۔

اکثر ماہرین نفسیات اس رائے سے متفق نہیں ہیں کہ ذہانت ایک ثابت شدہ موروثی صفت ہے، اور اس میں ماحول کی کوئی تاثیر نہیں ہوتی، جیسے کہ لوگ کہتے ہیں کہ اگر بچہ ذہین پیدا نہ ہو تو آپ اس کی ذہنی ترقی کے لیے کچھ نہیں کر سکتے، اس طرح کی رائے کا نقصان بالکل واضح ہے، اگر چہ اس میں کوئی شک نہیں کہ بچہ پیدائشی طور پر بہت سی صلاحیتیں لے کر پیدا ہوتا ہے، اور یہ صلاحیتیں بچے کی ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں، لیکن تعلیم وتربیت کے اچھے ماحول سے ایسے بچوں کی ذہانت میں بھی اضافہ کیا جا سکتا ہے جو پیدائشی طور بہت زیادہ ذہین نہ ہوں یا جن کے دماغ میں چوٹ لگی ہو، انھیں بھی تعلیم وتربیت کے ذریعہ سکھایا جا سکتا ہے کہ مختلف حالات میں کیا کرنا ہے۔

بہت سے بچے ایسے ہوتے ہیں جن کو دوسرے بچوں سے زیادہ توجہ اور تعلیم وتربیت کی ضرورت ہوتی ہے، بسا اوقات ایک بچے کو پوری کلاس سے زیادہ توجہ درکار ہوتی ہے، لیکن اگر صبر وتحمل کے ساتھ ایسے بچے پر توجہ دی جائے، یا اس کے مناسب حال افضل ترین طریقۂ تعلیم وتربیت کو تلاش کر کے اس کے لیے اختیار کیا جائے تو اس کی فہم وادراک اور ذہنی استعداد میں اضافہ ممکن ہے۔

البتہ اس حصولیابی کا بہت کچھ مدار بچے کی خوداعتمادی، ناکامی کا خوف کیے بغیر بدون تردد اقدام وتجربہ کرنے کی صلاحیت اور، لوگوں کی تنقیدوں کے تئیں زیادہ حساس نہ ہونے پر بھی ہے اس لیے اس ناحیے سے اگر کوئی کمی ہو تو اس پر بھی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

عام طور پر ذہنی صلاحیت کو جانچنے کے لیے ماہرین نفسیات ایک جانچ (Test) کرتے ہیں، وہ اس جانچ (Test) کا نام ''مقدار ذہانت''(IQ) دیتے ہیں، اگر نتیجہ ۱۰۰ فیصد ہوتا ہے تو اکثر لوگوں کے نزدیک اسکو فطری معیار شمار کیا جاتا ہے، ذہانت اگر ۹۰ سے ۱۱۰ فیصد کے درمیان ہوتی ہے تو اس کو بھی فطری حدود میں ہی شمار کیا جاتا ہے، البتہ ۹۰ سے نیچے اور ۱۱۰ سے اوپر اگر نتیجہ آئے تو اس کو فطری حدود سے خارج شمار کیا جاتا ہے، یہ بات ملحوظ رکھنا چاہیے کہ یہ اعداد کسی بالکل مسلم امر کی طرف اشارہ نہیں کرے، ضروری نہیں کہ یہ اعداد پورے طور پر منطبق ہی ہوں، جیسے انسان کی لمبائی اور اس کا وزن متعین حدود سے آگے پیچھے ہو سکتا ہے ویسے ہی

(IQ) سے متعلق ان اعداد کو بھی سمجھنا چاہیے، اس لیے کہ ذہانت کا مسئلہ ان اعداد سے کہیں زیادہ پیچیدہ ہے، ذہانت سلوک کے طریقوں کا اظہار کرتی ہے، ذہانت کا پتہ انسان کی اس قدرت سے بھی چلتا ہے جو وہ مسائل ومشکلات کے حل کے لئے استعمال کرتا ہے، اس بات کی وضاحت کے لیے ہم ایک مثال پیش کرتے ہیں، ذرا تصور کیجئے ایک ایسے شہر میں جہاں آپ دوپہر کے وقت بھیڑ میں ہوں اور وہیں شہر میں ایک اجنبی آجائے وہ کسی جگہ کی تلاش میں ہو لیکن اس شہر کی زبان سے ناواقف ہو، نہ ہی اس کے راستوں کا اس کو علم ہو، لوگوں کو خود اپنے کاموں اور بھیڑ کے سبب جلدی ہو، اس صورت میں مشکلات اور پریشانی کے سبب اس انسان سے کیسی کیسی حرکتیں صادر ہوں گی، لوگ اس کو پریشان، کم عقل اور جانے کیا کیا سمجھیں گے، حالانکہ وہی انسان جب اپنے وطن میں ہوگا تو مشکل ترین کام اور ایسے پیچیدہ امور کو انجام دے گا جو اعلیٰ درجہ کی ذہانت سے ہی انجام پاتے ہیں، پھر سوال یہ ہے کہ اس کی وہ ذہانت اس موقع پر کہاں غائب ہوگئی؟ ظاہر ہے کہ اس نے مذکورہ بالا اعداد میں سے مقدار ذہانت کے جو اعداد جانچ میں حاصل کیے تھے وہ اپنے شہر میں حاصل کیے تھے لیکن اجنبی صورت حال میں اس کی اس مقدار ذہانت کا کوئی کام نہیں رہ گیا اور اس سے اس کا کوئی فائدہ نہ ہوا۔

یہ صحیح ہے کہ کہ مقدار ذہانت (IQ Test) سے ہم کسی انسان کی ذہانت، کیفیت اور زندگی میں اس کے تصرفات کا خاطر خواہ اندازہ کر سکتے ہیں، لیکن یقین کے ساتھ ہم اس کی بنیاد پر یہ پیشین گوئی نہیں کر سکتے کہ وہ حقیقی زندگی میں تصرفات کے طریقوں سے کس قدر واقف ہے۔

ہم اکثر کسی انتہائی ذہین و ماہر شخص کے بارے میں سنتے رہتے ہیں کہ وہ اپنے تخصصات (Specialization) میں بڑے بڑے مسائل کو حل کرتا ہے، لیکن وہی شخص اپنے تخصصات سے ہٹ کر دوسرے میدانوں کے چھوٹے چھوٹے مسائل بھی حل نہیں کر پاتا، ایک آدمی دسیوں زبانوں پر دسترس رکھتا ہے لیکن وہ خود اپنی گاڑی کے پرزوں کے نام سے بھی واقف نہیں ہوتا، ایک شاعر بہترین قصیدے لکھتا ہے، ایک ناول نگار بڑے دلچسپ ناول تصنیف کرتا ہے مگر وہ ریاضی کے ہلکے پھلکے حساب بھی نہیں لگا پاتا، ایک سائنٹسٹ کو اپنی فیلڈ میں بڑا کمال حاصل ہوتا ہے مگر وہی شخص اپنے مافی الضمیر کو واضح انداز میں بیان نہیں کر پاتا، یہ تمام مثالیں اس امر پر دلالت کرتی ہیں کہ ایسا ممکن ہے کہ ایک ہی انسان ایک میدان میں بڑا ماہر ہو لیکن دیگر مشکلات ومسائل میں بے بس نظر آئے۔

بچے کی ذہانت کی نشو ونما میں ماں باپ کا کیا کردار ہے:

ماں باپ کے لئے اہم بات یہ ہے کہ وہ بچے کو کثرت سے ایسے مواقع فراہم کریں جس سے بچے کے اندر مشکلات ومسائل کے حل کی قدرت پیدا ہو اور وہ اس جانب توجہ کرنا سیکھے، اس لیے غیر حقیقی امیدوں کا شیش محل بنانے سے ماں باپ کو اجتناب کرنا چاہیے، بچے کے بارے میں یہ یقین نہیں کر لینا چاہیے کہ اس کے اندر بہت محدود قدرت وصلاحیت ہے، حتی کہ اگر اس کو اسکولی زندگی میں بعض تعلیمی مشکلات پیش آئیں تو بھی یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ یہ تو تعلیمی میدان میں ناکام ہے، اس طرح کا نتیجہ اخذ کرنا بجائے خود اس کی ترقی اور اس کی نشو ونما پر اثر انداز ہوتا ہے، اس لیے کہ ہم اس طرح کی توقعات سے بچے کو اپنے سلسلے میں منفی رائے اور زندگی میں منفی طرز عمل اختیار کرنے پر آمادہ کرتے ہیں، جس کا اس کی زندگی پر گہرا اثر پڑتا ہے۔

بچے کی طاقت واستطاعت کے بقدر چھوٹے چھوٹے کاموں کے بارے میں سوچیے جنھیں وہ کر سکے، اس کے ساتھ کچھ اضافی وقت گزاریے بالخصوص ان کاموں کی انجام دہی میں اس کا ساتھ دیجئے جن میں اس کو مشکل پیش آتی ہے، جیسے اسکول کے ہوم ورک میں اس کو مشکل پیش آتی ہے تو ہوم ورک کرتے ہوئے اس کے ساتھ وقت گزاریے، کوشش کیجئے کہ اس کے اندر اعتماد کا احساس

جاگے، اس میں یہ شعور پیدا ہو کہ علم کا سیکھنا ایک مفید اور دلچسپ وسود مند عمل ہے، ماں باپ کو یہ سمجھنا چاہیے کہ کبھی کبھی بچے کی ناکامی کا سبب اس کی ذات کے اعتبار سے چھوٹے چھوٹے متعدد امور کا جمع ہو جانا بنتا ہے، مثلا درس میں ناغہ ہو گیا، اسکول میں چھوٹی سی بات کو سمجھ نہیں سکا، استاد سے سنے ہوئے کسی لفظ نے اس کے احساس کو زخمی کر دیا، یا نصاب میں موجود کسی موضوع میں نمبرات کے کم آنے نے بچہ کی خوداعتمادی پر منفی اثر ڈالا، یا بچے اس کے کاموں اور اس کی غلطیوں پر اس کا مذاق بنانے لگے، بہر حال کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ان ہی جیسی چھوٹی چھوٹی باتوں کا جمع ہو جانا بچہ کی کامیابی سے دوری کا سبب بن جاتا ہے، اور عام طور پر والدین ان امور میں تساہلی سے کام لیتے ہیں، ایسے موقع پر والدین کے لیے بہت مفید ہوگا کہ اپنے بچے کی عمر کو سامنے رکھ کر اپنی زندگی اور اس وقت کے اپنے احساسات کو یاد کریں، پھر اس کے ذریعہ وہ اپنے بچے کی اچھی طرح مدد کر سکیں گے۔

والدین کو چاہیے کہ وہ بچے کو اس کا عادی بنائیں کہ ان کے ساتھ گھر میں یا گھر کے باہر جو کچھ بھی پیش آئے اس کے سلسلہ میں وہ والدین سے بات ضرور کریں، اگر بچے نے یہ محسوس کر لیا کہ وہ جیسے ہی بتائے گا کہ اس نے امتحان میں اچھے نمبرات نہیں حاصل کیے یا استاد کی طرف سے اس کے کام پر اس کو سزا ملی تو والدین ناراض ہو جائیں گے، تو وہ کبھی بھی ہرگز ہرگز ان امور پر والدین سے بات نہیں کرے گا، اس کے ساتھ جو کچھ بھی ہوگا اسے وہ والدین کے غصے سے بچنے کے لئے ان سے چھپائے گا اور ہر وقت اسی فکر میں رہنے کی وجہ سے بے اطمینانی کی کیفیت سے دوچار رہے گا، والدین کی ملامت سے اور ڈانٹ پھٹکار سے بچنے کے لئے وہ خاموشی کی پناہ لینا پسند کرے گا، اس لئے ضروری ہے کہ والدین بچے کو یہ باور کرائیں کہ چاہے جو کچھ ہو جائے مگر وہ ہمیشہ اور ہمہ وقت بچے کی بات پورے سکون واطمینان سے سننے کو تیار رہتے ہیں، بچے کو یہ یقین ہونا چاہیے کہ والدین نہ اس کو ملامت کریں گے نہ اس پر تنقید کریں گے اور نہ اس پر احکام نافذ کریں گے، اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ والدین اسے غلطی کرنے دیں گے، اس کی غلطی کی تصویب نہیں کریں گے آئندہ اس کو کیا کرنا چاہیے اس کی رہنمائی نہیں کریں گے، نہیں بلکہ مقصد یہ ہے کہ والدین ہمیشہ منصفانہ انداز میں اس کے مددگار ثابت ہوں، اس کو یہ محسوس ہو کہ والدین اس کی تایید کرتے ہیں اور اس کی مدد کو تیار رہتے ہیں۔

والدین کا یہ سلوک اس پر بھی دلالت کرے گا کہ وہ سمجھتے ہیں کہ ابتدائی عمر میں زندگی کے مسائل کو حل کرنے کی صلاحیت بچے میں محدود ہوتی ہے، اکثر جب بچہ غلطی کرتا ہے تو ہم یہ فرض کر لیتے ہیں کہ اس نے قصدا خطا کی ہے، پھر ہم سمجھتے ہیں کہ اس کی صلاحیت ایسی ہے کہ خطا نہ کرنے کا عزم کرے اور صحیح طریقہ سے کام انجام دے، (حالانکہ صحیح بات یہ ہے کہ بچہ اتنا باشعور نہیں ہوتا)، ہونا یہ چاہیے کہ ہم سہولت سے تنبیہ کرتے رہیں، ہدایات دیتے رہیں حتی کہ بچہ خود ہمارے مطالبات کو پورا کرنے لگے۔

بسا اوقات ہم دیکھتے ہیں کہ کسی بچہ کو مسلسل عتاب وسرزنش اور ملامت سے سابقہ پڑتا رہتا ہے، یہاں تک کہ اس کا حال یہ ہو جاتا ہے کہ اگر اس سے کوئی غلطی سرزد ہو جائے تو یہ سمجھ کر کہ اس نے خود ''جان بوجھ کر'' غلطی کی ہے اپنے آپ کو کوسنے اور ملامت کرنے لگتا ہے، اس لیے والدین کو خیال رکھنا چاہیے کہ کہیں بچہ اس صورت حال میں نہ داخل ہو جائے۔

بچہ کو اگر اسکول کے کام میں کوئی پریشانی پیش آ رہی ہے تو اس کے حقیقی سبب کو تلاش کرنے کی کوشش کیجئے، کہیں ایسا تو نہیں کہ استاد نے مناسب انداز میں مسئلہ واضح نہیں کیا: کہیں ایسا تو نہیں کہ بچہ پوچھنے کے لئے استاد کے قریب جانے سے ڈرتا ہے! کہیں ایسا تو نہیں کہ اس کو بنیادی معلومات ہی نہ ہوں اس لیے آگے نہ بڑھ پا رہا ہو! یا ایسا تو نہیں کہ وہ اسکول جانے میں راحت (Comfert) نہیں محسوس کرتا، یا ایسا تو نہیں کہ وہ گھر میں کسی سبب سے خوش نہیں ہے۔

بسا اوقات بچے کی تعلیمی کمزوری اور پریشانی کا سبب یہ ہوتا ہے کہ وہ استاد سے مدد کرنے کا مطالبہ نہیں کرتا، اس کے لیے بعض مرتبہ خود اساتذہ بھی ذمہ دار ہوتے ہیں، کیوں کہ ایسا یا تو بچے کی غلطی پر ان کے سخت ردعمل کی بنیاد پر ہوتا ہے یا اس لیے کہ انھوں نے ہی بچے کو یہ نہیں سکھایا کہ سیکھنے کے مرحلہ میں خطا کا ارتکاب سیکھنے کے عمل کا یا تعلیم کا بنیادی عنصر ہے، یہ بات اساتذہ کو اس طرح بچے کو سکھانا چاہیے کہ وہ ناکامی اور خطا کے درمیان تمیز کر سکے، اگر ایسا نہ ہو تو پھر بچہ اپنی غلطیوں کو چھپانے کا عادی ہو جاتا ہے بجائے اس کے کہ وہ غلطی پر تصحیح کا مطالبہ کرتا اور خطا کے بارے میں جاننا چاہتا، پھر یہ مرحلہ آتا ہے کہ وہ حیلے بہانے کرنے لگتا ہے۔

یہ درست ہے کہ والدین استاد کا مزاج اور طریقہ کار بہت زیادہ نہیں تبدیل کر سکتے، (کیوں کہ زیادہ سے زیادہ وہ ایک آدھ مرتبہ توجہ ہی دلا سکتے ہیں) مگر وہ بچے کے سامنے اس کی اچھی طرح وضاحت کر سکتے ہیں کہ غلطی کا ارتکاب کبھی بھی شرمندگی کا باعث نہیں ہوتا، ہم میں سے ہر ایک غلطی کرتا ہے، غلطی کرنا کوئی عار کی بات نہیں البتہ ہم کو یہ سیکھنا چاہیے کہ ہم کس طرح آئندہ غلطی سے بچ سکتے ہیں، اس طرح والدین کو چاہیے کہ اپنے ردعمل اور ناصحانہ طریقہ کار سے بچہ کو سکھائیں کہ وہ اپنی غلطیوں کو چھپانے کی کوشش نہ کرے، غلطیوں کے ظاہر ہونے سے بالکل نہ ڈرے، اس طرز عمل سے صرف تعلیمی عمل میں اس کی مدد نہیں ہوگی بلکہ یہ عمل بچے اور والدین کو ایک دوسرے سے قریب کرنے میں بھی معاون ہوگا، یاد رکھنا چاہیے کہ بہترین دوست وہ ہوتا ہے جس کے پاس آپ مشکلات کے وقت جانا پسند کریں اور جو مشکل وقت میں آپ کو کوسنے کے بجائے فوری امداد فراہم کرے، اکثر و بیشتر والدین کو یہ کہتے ہوئے سنا گیا ہے جبکہ وہ اپنے بچے کے کسی مشکل میں پھنسنے یا کسی پریشانی میں پڑنے کے بارے میں سنتے ہیں تو کہتے ہیں ''کاش شروع میں ہی وہ یہ بات ہم کو بتا دیتا''، اس موقع پر وہ بھول جاتے ہیں کہ بچہ اپنے سابقہ تجربات سے یہ سیکھ چکا ہے کہ اگر اس نے اپنی پریشانی کے بارے میں بتایا تو وہ دوبالا ہو جائے گی اور حل ہونے کے بجائے مزید پیچیدہ ہو جائے گی۔

اخلاقی اور دینی نشو و نما

اس سے سبھی واقف ہیں کہ بچہ اپنی ابتدائی عمر میں معانی و مفاہیم کو سمجھنے اور ان کا ادراک کرنے میں پریشانی محسوس کرتا ہے، بالخصوص وہ اخلاقی اور دینی مسائل و معاملات کو نہ سمجھ پاتا ہے اور نہ برت پاتا ہے، غلط اور صحیح میں تمیز کرنا اس کے لیے مشکل ہوتا ہے، لیکن ماں باپ کو سمجھنا چاہیے کہ غلط اور صحیح کے جو پیمانے ہم متعین کرتے ہیں وہ اکثر و بیشتر ہمارے مناسب حال اور ہماری رغبتوں کے موافق ہوتے ہیں، مثلاً ہمارے نزدیک صحیح موقف یہ ہوتا ہے کہ بچہ اطاعت گذار ہو اور جب ہم چاہیں تو وہ خاموش اور پرسکون رہے، مہمانوں کو پریشان نہ کرے، اپنے کمرے کا سامان ترتیب سے رکھا رہنے دے، سرکشی پر نہ آمادہ ہو، ہماری ان خواہشات کے برخلاف عمل ہمارے نزدیک خطا شمار ہوتا ہے، یہ سمجھنا بہت آسان ہے کہ بعض والدین خطا و صحیح کا یہ موقف کیوں اپناتے ہیں لیکن یہ ضروری ہے کہ ہم اس کے استعمال میں مبالغہ سے کام نہ لیں۔

ہمیں یہ ملحوظ رکھنا چاہیے کہ اس عمر میں بچوں کے تعلق سے ہمارا جو موقف ہوتا ہے اسی کی روشنی میں وہ خود بھی اپنے متعلق رائے قائم کرتے ہیں، چنانچہ اگر وہ ہمارے کہنے کے مطابق عمل کرتے ہیں تو اپنے کو ''اچھا'' سمجھتے ہیں، اور اگر ہماری مرضی پر عمل نہیں کرتے تو اپنے کو ''برا'' سمجھتے ہیں اس سے قطع نظر کہ ان کا یہ عمل خود ان کے لیے منصفانہ ہے یا نہیں، ہمکو یہ ہرگز نہیں فراموش کرنا چاہیے کہ بچے کی اپنی بھی ایک مستقل ذات ہے، آزادی اور استقلال بھی اس کا حق ہے، بلا شبہ والدین اس کے بھی خواہاں ہوتے ہیں کہ بچہ کی نشوونما کے ساتھ ساتھ اس میں خود سوچنے کی صلاحیت بھی پروان چڑھے، اور وہ خود ہی اچھائی کو اچھائی سمجھ کر اختیار کرے، برائی کو برا سمجھتے ہوئے اس سے اجتناب کرے، نہ کہ بس اسی پر اکتفا کرے جس کا والدین کی طرف سے اس کو پابند کر دیا جائے۔

والدین کے لیے یہ بھی سودمند ہے کہ وہ حرام وحلال میں فرق کریں، کیا چاہتے ہیں اور کیا نہیں چاہتے ہیں اس میں بھی فرق کریں، مثلا وہ چاہتے ہیں کہ بچہ بے بجے سوجائے تو اس کو یہ محسوس نہ کرائیں کہ اس کا ایسا نہ کرنا حرام ہے، یہ ملحوظ رہے کہ بسا اوقات والدین اپنی دین سے دوری کے سبب بچوں پر اپنے افکاروخواہشات کو لادنے کے لئے ان کو اس طرح کا احساس دلاتے ہیں کہ گویا یہ چیزیں ان پر دینی اعتبار سے فرض ہیں، اس صورت میں بچہ گناہ کے احساس کے ساتھ پروان چڑھتا ہے اور یہ احساس اس حد تک ہوتا ہے کہ اگر اس نے اپنے کمرے کا نظم ونسق قائم نہیں رکھا تو اس کو لگتا ہے کہ اس نے حرام کا ارتکاب کیا، جب بھی وہ اپنے سے بڑے کسی شخص کے سامنے اپنے موقف کا دفاع کرتا ہے تو اس کو یہ احساس دامن گیر ہوتا ہے کہ اس نے حرام کا ارتکاب کیا، دینی اعتبار سے ایک گناہ کر ڈالا، اس لیے کہ والدین کے سلوک سے اس کے اندر یہ احساس پیوست ہو گیا کہ والدین سے مباحثہ (Discussion) یا ان کے سامنے اپنا دفاع حرام ہے۔

بلا شبہ بچوں کو دوسروں کا احترام کرنا سیکھنا چاہیے، لیکن احترام ولحاظ کرنے کی یہ عادت اس سے نہیں پڑے گی کہ ہر وقت والدین اس کے سامنے یہ دہرائیں کہ "اس نے حرام کا ارتکاب کیا"، "اس نے برا کیا" بلکہ یہ عادت اس کو کچھ آسان سے اصول بتانے اور ان کی مختصر سی وضاحت کرنے سے پیدا ہوگی، بچے کو یہ احساس بھی دلایا جائے کہ دوسروں کی طرح خود اس کے اپنے بھی حقوق ہیں، اسی طرح والدین کو چاہیے کہ گھر کے اندر وہ خود اپنی زندگی مرتب ومنظم رکھیں اور ہر وقت یہ ملحوظ رکھیں کہ ان کا بچہ بھی ان کے ساتھ ہے جو ان ہی کو دیکھ کر سیکھ رہا ہے، ان کو اپنے تصرفات کرنے سے قبل اپنے بچے کے بارے میں سوچنا چاہیے، ایسا نہ ہو کہ وہ بچے کے وجود کو فراموش کر کے اپنے امور انجام دیں، مثلا والدین ایک ایسا سامان خریدیں جو نازک ہو اور جس کے جلدی ٹوٹنے کا خطرہ ہو، پھر بچے سے کہیں کہ اس کو توڑنا مت! اس سے بہتر ہے کہ وہ ایسے سامان کو خریدنا موخر کر دیں حتی کہ وہ اتنا بڑا ہو جائے کہ اپنے آپ پر قابو پا سکے۔

والدین کو کوشش کرنا چاہیے کہ وہ کچھ وقت بچے کے ساتھ اس لئے گزاریں کہ اس کو ان کاموں کی برائی کا فرق سمجھا سکیں جو صرف اس لئے برے ہیں کہ والدین کے لیے پریشان کن ہیں اور ان برائیوں کو سمجھائیں جو شرعی اور اخلاقی اعتبار سے بری ہیں، مثال کے طور پر جب والدین آرام کرنا چاہیں تو کھیل کود سے شور مچانا، مٹی میں لت پت چپل گھر میں لانا، کوئی ناجائز اور حرام کام نہیں، اس کا تعلق محض والدین کی راحت اور ان کے ساتھ تعاون سے ہے، اس کے بالمقابل کسی دوسرے بچے کو مارنا پیٹنا یا جو چیز اس کی نہ ہو وہ زور زبردستی سے چھین کر لے لینا اخلاقی اور شرعی خطا ہے، ظاہر ہے کہ یہ عمل ہر صورت میں حرام ہے، بچے کے سامنے اسی چیز کو واضح کرنا چاہیے کہ کھیل کود میں اس کا شور مچانا کس طرح اور کیوں پریشان کن عمل ہے، اس کو سمجھانا چاہیے کہ وہ سکون کے ساتھ بھی کھیل سکتا ہے یا کسی اور وقت بھی کھیل سکتا ہے، وہ مٹی میں سنے ہوئے یہ چپل پہن سکتا ہے مگر جب گھر سے باہر نکلے یا کھیل کود میں مشغول ہو تبھی پہنے، اس کے برعکس دوسروں کو مارنا پیٹنا، یا جو چیز اس کی نہیں اس کو لے لینا کسی وقت اور کسی حال میں درست نہیں، ممکن ہے کہ بچہ یہ سوال کر بیٹھے کہ کیوں کسی وقت اور کسی حال میں درست نہیں؟ تو اسے اس طرح سمجھایا جا سکتا ہے کہ کیا ہم کو اگر کوئی مارے یا ہماری کوئی چیز چھین لے تو ہمیں اچھا لگے گا، تو جس طرح ہمیں نہیں اچھا لگے گا اسی طرح دوسروں کو بھی ہمارا یہ عمل اچھا نہیں محسوس ہوگا، اس صورت میں بچہ والدین کی بات قبول کرے گا، اس تشریح سے اس کو بہت فائدہ ہوگا، وہ بہ آسانی سیکھے گا کہ دوسروں کے بھی حقوق، حاجات اور احساسات ہوتے ہیں۔

اخلاقی امور مثلا لڑائی، چوری اور جھوٹ وغیرہ کی وضاحت زیادہ آسان ہے بہ نسبت ان کاموں کے جو صرف اور صرف پریشان کن ہیں مثلا شور کرنا، گھر کے سامان کو گندا کرنا وغیرہ، بچے

کے لئے یہ سمجھنا تو زیادہ آسان ہوتا ہے کہ یہ وہ اخلاقی عادتیں ہیں جن کو دوسرے لوگ پسند نہیں کرتے بہ نسبت اس کے کہ وہ یہ سمجھ سکے کہ ابا جان شور کرنے سے کیوں پریشان ہوتے ہیں اور اماں جان فرش گندا کرنے سے کیوں ناراض ہوتی ہیں، بچہ اپنی فطرت سے مجبور ہوتا ہے اس کے لیے خاموش رہنا ممکن نہیں اس لیے وہ نہیں سمجھ پاتا کہ اس کے ماں باپ شور نہ مچانے پر کیوں اصرار کرتے ہیں اور کیوں پرسکون رہنے کی تاکید کرتے ہیں، بچہ تو گھر کے ہر کام کو کھیل سمجھتا ہے، حتی کہ کھانا پکانے اور صفائی کرنے کا عمل بھی وہ کھیل ہی سمجھتا ہے، یہی وجہ ہے کہ اگر آپ صفائی کے کام میں اس کو شریک کرنا چاہیں تو وہ بآسانی پوری رغبت ونشاط کے ساتھ آپ کا ہاتھ بٹانے پر تیار ہوجاتا ہے، لیکن وہ یہ کام محض طبیعت کو بہلانے والا کھیل سمجھ کر کرتا ہے اور اس سے لطف اندوز ہوتا ہے خواہ اپنی ماں کے لئے دوگنے کام اور دوہری محنت کا ہی سبب کیوں نہ بن رہا ہو مگر وہ ماں کے پیچھے لگا رہتا ہے اور اس کے ساتھ شریک عمل رہتا ہے۔

جیسا کہ اس کا ذکر گذر چکا ہے کہ یہ اسلوب کبھی بھی سودمند نہیں ہوتا کہ ''تم ایسا کرو کیوں کہ میں کہہ رہا ہوں'' بلکہ فائدہ مند یہ ہے کہ والدین بچے میں یہ احساس پیدا کریں کہ اگر گھر کا ہر شخص دوسروں کی ضروریات کے بارے میں سوچے گا تو پھر گھر کا ہر فرد پرسکون اور عمدہ زندگی گزار سکے گا، لیکن والدین کو معجزات کی توقع نہیں کرنا چاہیے، کیوں کہ ایسا بھی ہوگا کہ وہ جب بھی بچے کو سمجھائیں گے اس کے سامنے پرسکون رہنے اور شور نہ کرنے کی وضاحت کریں گے، وہ تھوڑی ہی دیر بعد بلکہ ممکن ہے کہ اگلے ہی لمحہ اس سے زیادہ تیز آواز میں شور شرابہ کرنے لگے، بچے اپنی عمر کے ابتدائی سالوں میں کسی بات کو زیادہ دیر تک یاد رکھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے، یا یہ کہ ان سے جس چیز کا مطالبہ کیا جائے اس کو انجام دینے پر اپنے آپ کو آمادہ کرنے اور اپنے آپ پر قابو پانے کی قدرت نہیں رکھتے، اس لیے والدین کو کوشش کرنی چاہیے کہ وہ اس معاملہ کو اس نظر سے نہ دیکھیں کہ بچہ جان بوجھ کر نافرمانی کر رہا ہے اور بالقصد ماں باپ کے حکم پر عمل نہیں کر رہا ہے، اس کے اس عمل کو اس کی دلیل نہیں سمجھنا چاہیے کہ وہ والدین کے ساتھ تعاون نہیں کر رہا اور ان کی بات نہیں مان رہا، یہ تو بچہ کی اس چھوٹی سی عمر میں اس کی فطرت کا حصہ ہوتا ہے اس لیے والدین کو اسے از سرِ نو یاددہانی کرانا چاہیے، سمجھانا چاہیے، پھر اگر وہ کھیلنے لگے تو مثلا والدین اس سے کھلونا لے سکتے ہیں اور اس کو سمجھا سکتے ہیں کہ مناسب وقت پر اسے کھیلنے کے لئے واپس کردیں گے، اس طرح والدین اس سے بغیر کسی سختی اور جذباتیت کے اسے سمجھا کر اس سے کھلونا واپس لے سکتے ہیں اور اسے یہ بھی معلوم ہوجائے گا کہ اس سے کھلونا کیوں لیا گیا، پھر وہ اس واقعہ سے اہم سبق بھی حاصل کرے گا، یہ طریقہ اس سے ہزار گنا بہتر ہے کہ والدین اس پر چیخیں، چلائیں اور غصہ دکھائیں، اس کو سرکش کہیں، بدسلوکی کرنے والا قرار دیں، اس موقع پر یہ بھی مفید ہوگا کہ والدین ان سے کھلونا تو لے لیں لیکن ان کو کسی اور کام (Activity) میں لگادیں تاکہ وہ خالی بھی نہ رہیں اور یہ مسئلہ بھی حل ہوجائے۔

بسا اوقات اس طرح کے رویے سے بچہ کو خود یہ احساس ہوگا کہ اپنے آپ پر کنٹرول کرنے میں اس کی پریشانیوں کو والدین سمجھتے ہیں اسی وجہ سے وہ ابھی اس سے کھلونا لے رہے ہیں اور اسے بعد میں مناسب وقت پر پردے دیں گے۔ وہ یہ بھی محسوس کرے گا کہ اس کی شرارتوں پر والدین نہ اسے گناہ کا احساس دلا رہے ہیں نہ اسے ملامت کر رہے ہیں، اس طرح وہ یہ سیکھے گا کہ گھر کے سارے افراد کو ایک دوسرے کا تعاون کرنا چاہیے، اگر سب مشترک آرام کی زندگی کے بارے میں سوچیں تو سب کو اپنی جگہ اچھی شکل میں پرسکون زندگی مل سکے گی۔

☆☆☆

❑ انکار حدیث

قدیم منکرین حدیث

محمد فرید حبیب ندوی

ابھی دوسری صدی شروع ہی ہوئی تھی کہ انکار حدیث کے تین نقطہائے نظر سامنے آئے، ایک نقطۂ نظر ان لوگوں کا تھا جو حدیث کو مصدر شریعت ہی نہیں مانتے تھے، دوسرا ان لوگوں کا تھا جو اخبار آحاد کا انکار کرتے تھے، اور تیسرا ان لوگوں کا جو ایسی احادیث کا انکار کرتے جو قرآن کے کسی حکم کی تائید وتاکید یا تفصیل کے بجائے کوئی مستقل حکم بیان کرتیں۔

ہمارے علم کے مطابق سب سے پہلے امام شافعی نے ان لوگوں کا تعاقب کیا، چنانچہ آپ نے اپنی کتاب ''الام'' کی ایک خاص فصل میں اپنے اور ایک منکر حدیث کے درمیان ہونے والے مناظرے کا ذکر کیا ہے، اسی طرح ''الرسالہ'' میں ایک طویل فصل اخبار آحاد کی حجیت میں قائم کی ہے۔

کتاب الام میں امام صاحب نے اپنے جس مناظرہ کی روداد بیان کی ہے اس کی مختصر تفصیل یوں ہے:

منکر حدیث: ایک طرف آپ قرآن کو بھی مانتے ہیں اور حدیث کو بھی اور پھر حدیث کو قرآن کے ہم پلہ قرار دیتے ہیں، جبکہ دوسری طرف اگر کوئی شخص قرآن کے کسی حرف میں بھی شک کرے تو آپ اس سے توبہ کا مطالبہ کرتے ہیں، لیکن اگر حدیث میں کوئی شک کرے تو ایسا نہیں کرتے، بلکہ خود آپ اور آپ کے ہم نوا بہت سے راویوں کو جھوٹا اور غلط قرار دیتے ہیں، اور میں نے دیکھا ہے کہ جب کوئی شخص حلت وحرمت پر دلالت کرنے والی روایات کو بیان کرتا ہے اور وہ روایت آپ کے یہاں ثابت نہیں ہوتی، تو آپ اسے جھوٹا تو کہتے ہیں، مگر اس سے توبہ کا مطالبہ نہیں کرتے اور نہ ہی کوئی سزا دیتے ہیں۔ جن احادیث کا یہ حال ہو ان کی بنیاد پر قرآنی احکام میں تقسیم وتفریق کیسے کی جا سکتی ہے، اور ان کی بنیاد پر یہ بات کہنا کیوں کر درست ہے کہ قرآن کا یہ فرض عام ہے اور یہ خاص، یہ حکم واجب ہے اور یہ مباح؟؟

امام شافعی: آپ نے تمام احادیث کو ایک خانے میں رکھ لیا، اس لئے یہ غلط فہمی ہوئی، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ہم ان ہی احادیث کو معمول بہا قرار دیتے ہیں جو یقینی طور سے ہمیں معلوم ہیں اور جن کی صداقت ہر طرح کے شک وشبہ سے پاک ہے۔ (اب رہا یہ سوال کہ صحیح احادیث کی بنیاد پر بھی قرآنی احکام میں تفریق وامتیاز کیوں کیا جاتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ خود اللہ تعالیٰ نے قرآن میں حدیث کی اتباع کا حکم دیا ہے)۔

منکر حدیث: اس کی کیا دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حدیث کی پیروی کا حکم دیا ہے؟

امام شافعی: اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد: ''هو الذي بعث في الأميين رسولًا منهم يتلو عليهم آياته ويزكيهم ويعلمهم الكتاب والحكمة'' (جمعہ:۲۰)

منکر حدیث: اس آیت میں کتاب سے مراد تو قرآن ہے، حکمت سے کیا مراد ہے؟

اماشافعی: حکمت سے مراد حدیث رسول ہے۔

منکر حدیث: کیا ایسا نہیں ہوسکتا ہے کہ کتاب اور حکمت دونوں سے قرآن ہی مراد ہو، یعنی کتاب سے بحیثیت عموم مراد ہو اور حکمت سے وہ احکام جو اس میں بیان کیے گئے ہیں۔

امام شافعی: کیا یہ درست نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں احکام مجملاً بیان کیے تھے اور رسول اللہ ﷺ نے ان کی وضاحت فرمائی؟

منکر حدیث: جی، یہ درست ہے۔

اماشافعی: تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ حدیث کے بغیر قرآن کا مطلب ومعنی معلوم نہیں کیا جاسکتا؟

منکر حدیث: لیکن اس کا تو مطلب یہ نکلے گا کہ حدیث نبوی قرآن ہی کو دوہرا رہی ہے، اس طرح تکرار کلام کا نقص پیدا ہوجاتا ہے۔

امام شافعی: پھر آپ ہی بتایئے کہ جب کتاب و حکمت دو چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے، تو آیا یہ دو چیزیں ٹھہریں گی یا ایک؟

منکر حدیث: ہوسکتا ہے کہ کتاب وسنت دو جداگانہ چیزیں ہی ہوں، جیسا کہ آپ فرماتے ہیں، اور اس کا بھی امکان ہے کہ دونوں سے ایک ہی چیز مراد ہو۔

امام شافعی: میرے خیال میں پہلی بات زیادہ صحیح ہے اور کتاب وحکمت دو الگ الگ چیزیں ہیں، کتاب سے مراد قرآن اور حکمت سے مراد حدیث، اور اس بات کی تائید قرآن سے بھی ہوتی ہے۔

منکر: قرآن سے کس طرح تائید ہوتی ہے؟

امام شافعی: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: واذکــرن مــا یتلـی فـی بیـوتـکـن مـن آیـات اللـه والحکمة خبیراً (احزاب:۳۴) اس سے پتہ چلا کہ ازواج مطہرات کے گھروں میں دو چیزوں کی تلاوت ہوتی تھی، قرآن کی اور حکمت کی۔

منکر: قرآن کی تلاوت تو سمجھ میں آتی ہے، حکمت کی تلاوت کے کیا معنی؟

امام: تلاوت کے معنی نطق کے ہیں، اور اس سے کتاب و سنت کا نطق مراد ہے۔

منکر: اس آیت سے تو یہ واضح ہوگیا کہ حکمت الگ چیز ہے اور قرآن الگ۔

پھر امام شافعی نے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

شافعی: اللہ تعالیٰ نے اتباع رسول کو ہم پر فرض قرار دیا ہے۔

منکر: قرآن میں یہ حکم کس جگہ دیا گیا ہے؟

امام: ارشاد خداوندی ہے: فـلا وربك لا یـؤمنون ...... تسلیماً (نساء:۶۵) دوسری جگہ ہے: مـن یطع الرسول فقد اطاع الله (نساء:۸۰) ایک اور جگہ ہے: فلیحذر الذین...... ألیم (النور:۶۳)۔

منکر: اس سے تو ثابت ہوا کہ رسول خدا کے حکم کو تسلیم نہ کرنے والا درحقیقت حکم خداوندی کو تسلیم نہ کرنے والا ہے۔

امام شافعی: جی یہی بات ہے، بے شک اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کے حکم کی بجا آوری کو فرض قرار دیا ہے، ومـا أتـاكم الرسول فخذوهن فانتهوا (حشر:۷)۔

منکر: اس سے تو صاف ہوگیا کہ رسول اللہ ﷺ کے اوامر و نواہی کی تعمیل ضروری ہے۔

امام: جی بالکل، رسول اللہ ﷺ کی اطاعت ہمارے لئے، ہم سے پہلے لوگوں کے لئے اور بعد میں آنے والوں کے لئے، سب کے لئے ناگزیر ہے۔

منکر: جی بالکل۔

امام: یہ بھی آپ جانتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے قرآن میں کسی حکم کو فرض کیا، تو رسول اللہ نے ہم کو بتایا کہ اس فرض کو کس طرح ادا کیا جائے۔

منکر: اس میں کوئی شک نہیں۔

امام: اب آپ بتائیے کہ آپ کے لئے اور آپ کے بعد آنے والے ان لوگوں کے لئے جنھوں نے رسول اللہ ﷺ کو نہیں دیکھا، فرائض خداوندی کو صحیح سے ادا کرنے کے لئے حدیث رسول کے سوا چارۂ کار ہے؟

اس کے بعد امام شافعی نے اس کے سامنے اس کی تفصیل بیان کی کہ قرآن کا ایک حصہ دوسرے حصے کو منسوخ کر سکتا ہے، مگر اس کو جاننے کا طریقہ حدیث رسول کے سوا کوئی اور نہیں۔

منکر: آپ نے اپنے دعویٰ کو بدلائل ثابت کر دیا ہے، میں اپنے سابقہ موقف سے رجوع کرتا ہوں اور اب میں تسلیم کرتا ہوں کہ مسلمانوں پر حدیث رسول کو ماننا فرض ہے۔

اس کے بعد اس نے مزید توضیح کے لئے چند اور سوالات کیے:

منکر: ذرا یہ بتائیے کہ ایسا کیسے ہوتا ہے کہ قرآن میں کبھی عام سے عموم مراد ہوتا ہے اور کبھی اس میں تخصیص مراد ہوتی ہے؟

امام شافعی: دراصل بات یہ ہے کہ عربی زبان نہایت وسیع زبان ہے، بسا اوقات ایک عام لفظ بول کر اس سے خاص مفہوم مراد لیا جاتا ہے، البتہ کسی عام لفظ سے خاص مفہوم اس وقت مراد لیا جا سکتا ہے، جب قرآن و حدیث میں اس کی کوئی دلیل موجود ہو، اس کے بعد امام شافعی نے اس کی کچھ مثالیں پیش کیں:

- قرآن میں نماز کا حکم سارے مسلمانوں کے لئے دیا گیا ہے، مگر حدیث میں حائضہ عورتوں کو اس سے مستثنیٰ قرار دیا گیا۔
- قرآن میں زکوۃ کا حکم عام ہے، مگر حدیث میں بعض اموال کو زکوۃ کے حکم سے مستثنیٰ کیا گیا۔
- والدین کے لئے وصیت کا جو حکم تھا، اسے وراثت کے احکام سے منسوخ قرار دیا۔
- قرآن میں وارثوں کے حصے مقرر کیے گئے، مگر حدیث نبوی کی رو سے کافر مسلمان کا اور مسلمان اپنے کافر آقا کا اور اسی طرح قاتل مقتول کا وارث نہیں ہو سکتا۔ اور یہ احکام حدیث سے ثابت ہیں۔

منکر: بے شک یہ احکام حدیث نبوی سے ہی ماخوذ ہیں، میری رائے ہمیشہ اس کے خلاف رہی، دراصل اس سلسلے میں (منکر حدیث) لوگوں کے بھی دو نقطہائے نظر ہیں: ایک فریق احادیث کو تسلیم ہی نہیں کرتا اور کہتا ہے کہ قرآن میں ہر چیز کی تفصیل موجود ہے۔

امام شافعی: اس کا نتیجہ کیا ہوا؟

منکر: اس سے بڑے دوررس نتائج برآمد ہوئے، ایک فریق تو کہنے لگا کہ کم سے کم جس چیز کو نماز کہا جا سکے وہی نماز ہے، اس میں وقت کی بھی کوئی پابندی نہیں، یہی معاملہ زکوۃ کا بھی ہے، چنانچہ اگر کوئی شخص ایک دن میں یا کئی دنوں میں دو رکعتیں بھی پڑھ لے، تو اس نے فریضہ نماز ادا کر لیا، اور جو چیز کتاب اللہ میں نہ ہو، وہ فرض نہیں ہو سکتی۔

دوسرے فریق نے کہا کہ اس حدیث کو قبول کیا جائے گا، جس میں ایسی بات کہی گئی ہے جو قرآن میں مذکور ہو، اور جو بات قرآن میں مذکور نہ ہو، وہ ایسی حدیث کو تسلیم نہیں کرتا، نتیجہ کے اعتبار سے یہ رائے بھی پہلی رائے کے قریب قریب ہے، چنانچہ یہ فریق ناسخ و منسوخ اور خاص و عام کو تسلیم نہیں کرتا، یہ دونوں نظریات گمراہی پر مبنی ہیں، اس لئے میں ان میں سے کسی کا بھی قائل نہیں۔

مگر اس کی کیا دلیل ہے کہ ایک حرام چیز کو ظنی دلیل سے مباح ٹھہرا جا سکتا ہے؟

امام شافعی: جی اس کی دلیل موجود ہے، ذرا یہ بتائے کہ یہ شخص جو میرے پاس بیٹھا ہے، اس کا خون اور مال حرام ہے یا نہیں؟

منکر: جی ہاں، اس کا خون و مال حرام ہے۔

امام شافعی: اگر دو آدمی اس کے بارے میں شہادت دیں کہ اس نے ایک شخص کو قتل کیا اور اس کے مال پر قبضہ کر لیا ہے، اس کے اور یہ پاس وہی مال ہے، تو اس کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہوگی؟

منکر: میں اسے قصاص میں قتل کر دوں گا اور یہ مال مقتول

کے ورثاء کو دے دوں گا۔

شافعی: کیا گواہ جھوٹی گواہی بھی دے سکتے ہیں؟

منکر: ہاں، اس کا امکان تو ہے؟

شافعی: پھر تم نے ایک ظنی دلیل (گواہی) کی بنیاد پر خون اور مال کو جن کی حرمت یقینی ہے، کیسے مباح قرار دے دیا؟

منکر: گواہی کا قبول کرنا ضروری ہوتا ہے۔

شافعی: جب آپ گواہی کو قبول کرتے ہیں، حالانکہ اس کے سچا ہونے کا یقین نہیں ہوتا، تو پھر ہم تو حدیث کے راوی میں گواہ سے بھی زیادہ صفات تلاش کرتے ہیں۔ چنانچہ بہت سے لوگوں کی گواہی تو قبول کر لی جاتی ہے، مگر ان کی روایت قبول نہیں کی جاتی، اس وجہ سے کہ وہ روایت کے معیار پر پورے نہیں اترتے۔ اب بتائیے، جب گواہ کی گواہی، آپ قبول کرتے ہیں، تو روای کی روایت کیوں نہیں؟

اس طرح امام شافعیؒ نے اس کے سامنے حقیقت واضح کی، تو اس نے اپنے سابقہ موقف سے توبہ کر لی اور حدیث کی حجیت کو قبول کیا۔

اس مناظرہ کے سلسلے میں چند گذارشات پیش ہیں:

۱۔ امام شافعی نے یہ نہیں بتایا کہ ان کا مدمقابل کس فرقہ سے تعلق رکھتا تھا، لیکن ان کی دوسری تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ جملہ احادیث کے انکار کا نظریہ اہل بصرہ کی ایجاد ہے، اور بصرہ ان دونوں معتزلہ کا گڑھ بنا ہوا تھا، ممکن ہے کہ امام شافعی کا حریف کوئی معتزلی ہی رہا ہو، شیخ خضری بک کی رائے یہی ہے کہ وہ کوئی معتزلی ہی تھا۔ (بعض لوگوں کی تحقیق کے مطابق وہ کوئی رافضی تھا) (اور غالباً وہ رافضی جو رسالت منکر ہیں۔

۲۔ یہ بات بھی سمجھنے کی ہے کہ جو لوگ بھی احادیث کا انکار کرتے تھے تو دراصل وہ ان کے طریق وصول پر معترض تھے، اور یہ سمجھتے تھے کہ چونکہ روایت میں راویوں کے وہم اور خطا کا امکان ہے، اس لئے یہ بات یقینی نہیں کہ یہ رسول اللہ کے ہی اقوال ہیں، ایسا کوئی بھی نہیں تھا جو احادیث کو اقوال رسول ماننے کے باوصف ان کا انکار کرتا ہو، اس لئے امت کے کسی بھی فرقے کا اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے اقوال واجب الاتباع ہیں، صرف روافض کا ایک فرقہ گذرا ہے، جو منکر رسالت محمدی تھا اور یہ رائے رکھتا تھا۔ مگر اس سے ہمیں کوئی سرکار نہیں کیوں کہ ہم اسلامی فرقوں کی بات کر رہے ہیں، مرتدین کی نہیں۔ ورنہ جو بھی احادیث کا انکار کرتا تھا تو اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ ظنی طریقے سے روایت کی گئی ہیں۔

ابن حزم نے لکھا ہے:

شریعت کے لئے اصل مرجع قرآن ہے، اس کے بعد حدیث ہے، اس لئے کہ قرآن میں ہم دیکھتے ہیں کہ اوامر رسول کی تعمیل کو فرض قرار دیا گیا ہے، کیوں کہ وہ وحی غیر متلو ہے، جس کی تعمیل ضروری ہے، نیز تیسری چیز جس کی طرف رجوع کیا جائے گا وہ اجماع ہے، جو اولی الامر سے ثابت ہے۔...... اس لئے کوئی بھی مسلمان جو توحید کا اقرار کرتا ہو، وہ جدل ونزاع کے وقت کتاب و سنت کے سوا کسی اور چیز کی طرف رجوع نہیں کر سکتا، اور اگر کوئی ایسا کرے گا تو وہ فاسق ہے، اور اگر اس جرم کو جائز سمجھ کر کرتا ہے تو وہ کافر ہے۔...... اگر کوئی کہے کہ ہم صرف قرآن کو مانیں گے تو وہ باجماع امت کافر ہے، کیوں کہ اس کے مطابق اگر ایک رکعت زوال الشمس سے غروب شمس تک اور ایک فجر کے وقت ادا کر لے، تو گویا نماز ہوگئی کیوں کہ نماز کا اطلاق کم از کم ایک رکعت پر کیا جا سکتا ہے۔ ایسی رائے رکھنے والا بالاتفاق کافر و مشرک ہے، اور یہ رائے امت میں کسی کی بھی نہیں ہے، سوائے غالی رافضیوں کی ایک جماعت کے، جس کے کفر پر پوری امت کا اجماع ہو چکا ہے۔

۳۔ جو لوگ تمام احادیث کا انکار کرتے ہیں ان کے دلائل کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن میں ہر بات کی تفصیل موجود ہے، اب اگر احادیث میں ایسے جدید احکام بیان کیے گئے ہوں جو قرآن میں مذکور نہیں، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ احادیث جن کا ثبوت ظنی ہے،

قرآن سے متصادم ہوں، حالانکہ دلیل ظن قطعی کی حریف نہیں ہو سکتی۔ اوراگر یہ حدیث سے کس قرآن حکمی کی ہی تائیدوتاکید ہورہی ہو، تو اس صورت میں اتباع قرآن کا ہورہا ہے، نہ کہ حدیث کا۔ اور اگر حدیث سے کسی قرآنی حکم کی تفصیل وتوضیح ہورہی ہو، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک قطعی الثبوت حکم کی تفسیر ظنی دلیل سے کی جارہی ہے، جوکہ دوست نہیں۔

یہ بات ذہن میں آتی ہے کہ شاید یہ منکرین متواتر احادیث کو تسلیم تے ہوں گے، کیوں کہ وہ قطعی الثبوت ہوتی ہیں، اگر بات ایسی ہی ہے تو پھر امام شافعی کی یہ بات کہاں تک درست ہے کہ یہ منکرین جملہ احادیث کورد کرتے ہیں۔

بظاہر یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ شاید متواتر کو بھی قطعی الثبوت نہ مانتے ہوں گے، بلکہ ان کے نزدیک متواتر بھی ظنی ہوں گی، اس لئے کہ متواتر کے راوی بھی تو وہی ہوتے ہیں، جو آحاد کے ہوتے ہیں، البتہ ان کی تعداد زیادہ ہوتی ہے، مگر تعداد کے کثیر ہونے کے باوجود جھوٹ کا احتمال ان میں بھی باقی رہتا ہے۔ اگر خضری بک کی یہ رائے کہ امام موصوف کا یہ حریف معتزلی تھا اور نظام معتزلی کی طرف منسوب یہ قول صحیح ہے کہ متواتر سے علم یقینی حاصل نہیں ہوتا، تو پھر اس بات میں کوئی شک نہیں رہ جاتا ہے کہ یہ لوگ جملہ احادیث بشمول متواترہ سب کورد کردیتے ہیں۔ چنانچہ ایسی صورت میں ہمارا یہ قول صحیح ہوگا کہ جو لوگ جملہ احادیث کا انکار کرنے والے ہیں، انہیں چاہیے کہ وہ ایک رکعت زوال اور غروب کے درمیان پڑھ لیں اور ایک رکعت فجر کے وقت، اس سے ان کی نماز ہوجانی چاہیے، کیوں کہ قرآن میں جو نماز کا حکم آیا ہے، اس کا اطلاق علی الاقل ایک رکعت پر ہوسکتا ہے۔

۴۔ اماشافعی کے جواب کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

۱۔ اللہ تعالیٰ نے ہم پر اپنے رسول کی اتباع واجب کی ہے، اور یہ حکم عام ہے، آپ ﷺ کے زمانے کے مسلمانوں کے لئے بھی اور آپ کے بعد کے لوگوں کے لئے بھی، اب ظاہر ہے کہ جس نے آپ ﷺ کو دیکھا نہیں اس کے لئے اتباع رسول کا راستہ احادیث کو قبول کرنے کے سوا اور کوئی نہیں۔ اس طرح یہ کہا جاسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں احادیث کے تسلیم وقبول کا حکم دیا ہے، اس لئے کہ اتباع رسول واجب ہے اور احادیث کے بغیر یہ ممکن نہیں، اور اصول یہ ہے کہ جس چیز کے بغیر کسی واجب کی پیروی ممکن نہ ہو، وہ بھی واجب ہوتی ہے۔

۲۔ خود قرآن کے احکام سے واقف ہونے کے لئے بھی حدیث کو قبول کرنا ناگزیر ہے، اس لئے کہ قرآن میں ناسخ ومنسوخ آیتیں بھی ہیں، اور اس کا پتہ لگانے کے لئے کہ کون سی آیت ناسخ اور کون سی منسوخ ہے، حدیث قبول کیے بغیر چارہ نہیں۔

۳۔ بہت سے ایسے احکام ہیں جن کو منکرین حدیث بھی مانتے ہیں، اور وہ قرآن سے ثابت نہیں، بلکہ ان سے واقف ہونا حدیث کے بغیر ممکن ہی نہیں۔

۴۔ شریعت میں قطعی احکام کی ظنی دلیل سے تخصیص کی مثالیں ملتی ہیں، جیسے جان اور مال کی حرمت یقینی ہے، مگر دو لوگوں کی گواہی سے وہ حلال ہوجاتے ہیں، حالانکہ دو لوگوں کی گواہی ظنی ہوتی ہے۔

۵۔ احادیث میں بھی گرچہ کذب خطا اور وہم کا احتمال ہوتا ہے، لیکن راویوں میں عدالت وثقاہت اور دیگر شرائط کی وجہ سے یہ احتمال اس سے کم ہے جو شہادت میں ہوتا ہے۔ خاص کر جب کسی حدیث کی تائید کسی آیت قرآنی یا دوسری حدیث سے بھی ہوجائے، اس وقت یہ احتمال تقریباً ختم ہی ہوجاتا ہے۔

☆☆☆

□فکر اسلامی

(قسط-۲۲)

مفکر اسلام- ایک مطالعہ

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

دنیااثبات سے چلتی ہے

آج کل ایک مزاج بن گیا ہے کہ اکثریت اور خاص طور پر ایک طبقہ صرف دوسرے کی نفی میں لگا رہتا ہے، حالانکہ اس سے کسی خیر کے وجود میں آنے کی امید نہیں، حضرت مولانا نے جامعہ سلفیہ کے ایک اجلاس میں ابن تیمیہ کے حوالے سے یہ بات کہی:

''شیخ الاسلام نے ایک بات اور بڑے کام کی کہی ہے، جس کی قدر علماء کلام وماہرین نفسیات ہی کر سکتے ہیں کہ فلسفۂ یونان کا زیادہ تر زور نفی پر ہے، وہ جب نفی پر آتے ہیں، تو بڑا وسیع میدان سامنے کر دیتے ہیں، اور جب ''اثبات'' کا موقع آتا ہے تو ایک دو لفظ بول کر خاموش ہو جاتے ہیں، صفات اور افعالِ الٰہی کے بارے میں ان کا یہی رویہ ہے، خالق عالم یہ نہیں ہے، یہ نہیں ہے، یہ نہیں ہے، لیکن وہ کیا ہے اور کیسا ہے؟ یہاں پر ایک ہی دو باتوں پر اکتفا کرتے ہیں، حالانکہ زندگی اثبات پر چلتی ہے، نفی پر نہیں، اس کے برخلاف صحف سماوی اور کلام انبیاء میں نفی مجمل ہے، اور اثبات مفصل، نفی کا موقع آیا تو فرمادیا کہ "لیس کمثلہ شیٔ" اس کے برخلاف اثبات سے سارا قرآن مجید بھرا ہوا ہے اور کہا گیا "وللّٰہ الاسمآء الحسنیٰ فادعوہ بھا''۔ (کاروان زندگی ج۵ص۵۶)

تنقید کا قرآنی انداز

لندن کے اسلامک سنٹر میں مولانا نے اپنی سالانہ شرکت کے موقع پر گفتگو کا آغاز قرآن کی اس آیت سے کیا۔

إلا تفعلوہ تکن فتنة فی الارض وفساد کبیر (سورۃ الانفال: ۷۳) ترجمہ: (تو مومنو!) اگر تم یہ کام نہ کروگے تو ملک میں فتنہ برپا ہو جائے گا اور بڑا فساد مچے گا۔ (کاروان زندگی ج۵ص۷۹)

اور آخر میں فرمایا اور بہت صراحت کے ساتھ فرمایا:

''اگر آپ نے اس ملک میں رہتے ہوئے زندگی کا ایک نیا ماڈل (Model) ایک نیا سانچہ اور ایک نیا نمونہ پیش کیا، جس میں یہاں کی زندگی، طرز معاشرت، نفس پرستی اور دولت پرستی اور ہر قسم کی آزادی سے امتیاز ظاہر ہوا، تو لوگوں کے اندر اسلام کے مطالعہ کا شوق پیدا ہوگا، وہ آپ کے یہاں آئیں گے اور کہیں گے کہ ہمیں کوئی کتاب دیجئے جس سے ہم سمجھیں کہ اس انقلاب کا سرچشمہ کہاں ہے؟ کہاں سے تبدیلی آئی اور آپ میں امتیاز پیدا ہوا؟'' (کاروان زندگی ج۵ص۸۵-۸۶)

ایک انقلاب انگیز جملہ

مولانا کو جس جملہ نے کبھی آرام نہ کرنے دیا اور جس کے سبب وہ ہمیشہ ایک کرب میں مبتلا رہے اور وقتاً فوقتاً متعدد جہتوں سے کوشاں رہے وہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کا ایک جملہ ہے مولانا اپنی ایک تقریر کا خلاصہ لکھتے ہیں:

''میں ایک تجربہ کار سیاح اور تاریخ کے طالب علم کی حیثیت سے کہنا چاہتا ہوں کہ انبیاء علیہم السلام کو چھوڑ کر سب سے بڑا تاریخ ساز انقلاب انگیز عہد آفریں فقرہ جملہ جس نے ایک نئی تاریخ کی بنیاد ڈالی ذہنوں میں انقلاب برپا کیا، ہزاروں مصلحین، مفکرین،

فلاسفر اور عظیم ترین انسان پیدا کئے، پوری ادبیاتِ عالم میں اور ادیان و مذاہب کی تاریخ میں اور معاشرہ پر اثر ڈالنے والے جملوں کی فہرست میں کسی نے اتنا اثر نہیں ڈالا جتنا صدیق اکبرؓ کے جملے أینقص الدین و أنا حیّ (میرے جیتے جی دین میں کمی ہو؟) نے اعتقادی، ذہنی، فکری اور عملی اعتبار سے اسلامی تاریخ میں ڈالا، یہی وہ کلمہ ہے جو دل کی ترجمانی کرنے والا، اور لوح دل پر نقش کرنے کے لائق ہے، اللہ نے صدیق اکبرؓ کو دین کی بقا و حفاظت کے لئے پیدا فرمایا تھا، اگر آپؓ عزیمت اور استقامت سے کام نہ لیتے تو دین اسلام کی بقا خطرہ میں تھی، آج منکرین زکوۃ نے اسلام کے ایک رکن پر حملہ کیا تھا، کل آہستہ آہستہ دوسرے ارکانِ اسلام پر حملہ کیا جاتا، دیگر مذاہب و ادیان کی تاریخ بتاتی ہے کہ جب ترمیم و تحریف کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے تو پھر وہ نہیں رکتا، یقیناً صدیق اکبرؓ کا یہ قیمتی اور وزنی فقرہ شاعروں کے دیوان اور اسلامی ادبیات میں اپنا ممتاز مقام رکھتا ہے۔ (کاروان زندگی ج ۵ ص ۲۰۵)

مولانا ماضی کو حال و مستقبل سے جوڑا کرتے تھے، یہ تاریخ ساز فقرہ اور اس پر ایسی مدبرانہ اور ولولہ انگیز گفتگو کے بعد مولانا نے جس طرح حالات کی تبدیلی کا ذکر کیا اور مسلمانوں کو جس چیز کی طرف توجہ دلائی اور سازش کا پردہ فاش کرتے ہوئے تبصرہ کیا وہ لائحہ عمل بنانے کے لائق ہے، اسی صدیقی فقرہ کو بنیاد بنا کر مزید گفتگو کرتے ہوئے فرمایا:

''سلسلۂ تقریر جاری رکھتے ہوئے حاضرین کو اس طرف توجہ دلائی گئی کہ اس وقت ملک میں مسلمانوں کے ملی تشخص، دینی عقائد اور اسلامی شعائر کے خلاف منصوبے تیار ہو رہے ہیں، زبان، اور رسم الخط کو بدلنے کی کوششیں کی جارہی ہیں، پورے ملک میں یکساں سول کوڈ کے لئے راہیں بنائی جارہی ہیں، اگر آپ R.S.S اور شیو سینا کے لیڈر بال ٹھاکرے کی کتابیں پڑھیں تو ان تمام سازشوں کا پتہ چلے گا، نہایت ذہانت، غور فکر اور قانونی دانش مندی کے ساتھ ایسا نقشہ بنایا جارہا ہے کہ مسلمانوں کی آئندہ نسلیں زبان، لباس کے اعتبار سے بالکل مختلف ہوں، اس لئے ہمیں اپنے ملی تشخص کی حفاظت کے لئے نعرۂ صدیقی کو اپنا منشور بنانا چاہیے، گھر لٹ جائے، جان چلی جائے، مگر ایمان نہ جائے، بھوکے رہ جائیں، مگر نماز نہ چھوٹے، آپ اپنے گھر کے ماحول میں تبدیلی پیدا کریں، انبیاء کرام علیہم السلام کی سیرت اور صحابہ کرامؓ کے واقعات اپنے بچوں کو سنائیں، اور ان میں اپنے دین پر قائم رہنے اور اس کے لئے ہر طرح کا ایثار اور خطرہ مول لینے کی ہمت و عزیمت پیدا کریں، اور اسلام و ایمان پر فخر کرنا سکھائیں اور کفر و شرک اور دوسروں کی نقالی سے نفرت و وحشت پیدا کریں، وہ قرآن شریف کی تلاوت کر سکیں اور اردو میں لکھ پڑھ سکیں، سیرت نبوی، صحابۂ کرام کے کارناموں اور اپنی قدیم تاریخ سے واقف ہوں'' (کاروان زندگی ج ۵ ص ۲۰۶)

علماء و اصحاب مدارس کے کرنے کا اصل کام

مولاناؒ نے ساری دنیا کا تقریباً سفر کیا، ہر ملک کا گہرائی کے ساتھ جائزہ لیا، مغربی تہذیب کو اس کے مراکز میں رہ کر دیکھا، اپنے وسیع مطالعہ اور تجربہ کی بنیاد پر انھوں نے جو تجزیہ پیش کیا وہ صد فیصد حقائق پر مبنی ہے اور آج تو اس کا ایسا زبردست مشاہدہ ہوتا ہے ہر قدم اور ہر جگہ پر کہ اس کی داستان بھی قلم بند نہیں کی جاسکتی، مغرب نے کمال عیاری کے ساتھ اپنے نظام تعلیم کو مسلمانوں کے حوالہ کیا اور پھر اس کے ذریعہ مسلمانوں میں اپنی ذات، اپنی صلاحیت حتی کہ اپنے مذہب کے سلسلہ میں احساس کہتری میں مبتلا کر دیا، مولاناؒ لکھتے ہیں:

''صورت یہ ہے کہ اس حریف نے اسلامی ممالک بلکہ مرکز قیادت و مرکز توجہ میں سب سے زیادہ جو مؤثر دعوت اور مؤثر انقلاب انگیز چیز ہوسکتی ہے وہ عالم اسلام کے لئے تجویز کی ہے، وہ یہ ہے کہ وہاں کے تعلیم یافتہ طبقہ میں احساس کہتری پیدا کی جائے اس کو انگریزی میں (INFERIORITY COMPLEX) کہتے ہیں، خاص طور پر اس طبقہ میں جو کہ ملک

کی رہنمائی کرسکتا ہے (قیادت کی جگہ لینے والا تعلیم یافتہ طبقہ ہی ہوتا ہے ،یونیورسٹیوں کے فضلاء کا یعنی انٹلکچول کلاس INTELLECTUAL CLASS مثقف طبقہ)ان کی حقیقت شناسی کی داد دینی چاہئے کہ جو طبقہ کسی ملک کی زمام اختیار و اقتدار لے سکتا ہے، سیاسی طور پر بھی، انتظامی طور پر بھی،، ذہنی وفکری طور پر بھی ،صحافت طور پر بھی وہ طبقہ ہے پڑھا لکھا طبقہ، تعلیم یافتہ طبقہ، یونیورسٹیوں کے فضلاء کا طبقہ، یہی طبقہ زمام قیادت سنبھال سکتا ہے، یہ طبقہ فکری قیادت بھی ہاتھ میں لے سکتا ہے، اس میں جو چیز زیادہ مؤثر ہوسکتی ہے عالم اسلام کو کمزور بنانے کے لئے اور مستقبل کی ضمانت کے لئے ،مستقبل میں مسلمانوں کے غیر مؤثر ہونے کے لئے اور حریف نہیں بلکہ حلیف بن جانے کے لئے اور ان مغربی تہذیب کے پورے طور پر (اگر بے ادبی نہ ہوتو کہا جائے)کلمہ پڑھنے والا بنانے کے لئے اور اس کے سامنے سر تسلیم خم کردینے کے لئے نہیں بلکہ اس کے داعی بن جانے اور اس کا مبلغ ہو جانے کے لئے جو چیز سب سے زیادہ مؤثر ہے وہ احساس کہتری ہے کہ مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقہ میں یہ خیال پیدا ہوجائے کہ اس ترقی یافتہ زمانہ میں اسلام کا کوئی مستقبل نہیں ۔'' (کاوروان زندگی ج ۷۔ص ۸۹۔۹۰)

یہ احساس کہتری کس حد تک پہونچ گیا ؟اس کا مشاہدہ تو ہم اور آپ اپنی زندگی میں روز کرتے ہیں، قدم قدم پر کرتے ہیں، لیکن ذرا اس کا قصہ مولاناؒ کی زبان سے سنئے:۔

''اس کے سمجھنے کے لئے ایک بات آپ کو بتاتا ہوں کہ جب میری کتاب "ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین" مصر میں چھپی، جس کو اس سطح سے لکھا گیا تھا کہ دنیا کو کیا فائدہ پہونچا تھا مسلمانوں کی ترقی سے، جب مسلمان دعوت وقیادت کے منصب پر فائز ہوئے اس میں دنیا کو ایمانی حیثیت سے، اخلاقی حیثیت سے، انسانی حیثیت سے، انتظامی وتنظیمی حیثیت سے، آپس کے تعلقات کی حیثیت سے اور اپنے منصوبوں اور عزام کے لحاظ سے کیا فائدہ پہونچا؟ اور جب مسلمان اقتدار اسے محروم کردئے گئے اس وقت دنیا کو کیا نقصان پہونچا؟ اس لحاظ سے تاریخ کا مطالعہ بہت کم کیا گیا تھا اور معاف کیا جائے اس پر بہت کم لوگوں نے قلم اٹھانے کی ضرورت سمجھی تھی یا جرأت کی تھی، جب یہ کتاب مصر میں چھپی اور ۱۹۵۱ء کے شروع میں جنوری میں ہمارا قاہرہ جانا ہوا تو ہماری موجودگی میں ایک مقبول اور بڑے اخبار میں یہ مضمون نکلا کہ ابھی ایک کتاب نکلی ہے جس کا نام "ماذا خسرا لعالم با نحطاط المسلمین" ہے، سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ نام رکھا کیسے گیا، کیا مسلمانوں کے تنزل اور پستی سے دنیا کو کچھ نقصان پہنچ سکتا ہے؟ کیا مسلمان اس پوزیشن میں ہیں کہ ان کے تنزل سے دنیا کو کچھ نقصان پہنچے؟ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ استاذ ندوی نے کیسے اپنی کتاب کا نام "ماذا خسرا لعالم با نحطاط المسلمین" رکھا، اس سے اندازہ کیجئے کہ یہ چیز دماغ میں کتنی بیٹھ گئی تھی اور علمی حلقہ میں پھیل گئی کہ مسلمانوں کو ایکٹر (ACTOR) سمجھا جائے ،یا کوئی تمدنی ڈرامہ ہورہا ہے، سیاسی ڈرامہ ہورہا ہے تو اس میں ایک ایکٹر یہ بھی ہیں جو ڈیوٹی بتائی گئی ہے کہ آپ کو یہ کرنا ہے وہ کرتے رہیں گے لیکن یہ بجائے ایکٹر (ACTOR) کے (FACTOR) عامل ومؤثر ہوں یہ نہیں ہو سکتا۔(کاروان زندگی ج ۷ ص ۹۳۔۹۴)

اس صوت حال سے مقابلہ کی جتنی اس وقت ضرورت تھی اس سے کہیں زیادہ آج ہے کیوں کہ وقت کے ساتھ بے اعتمادی اور احساس میں اضافہ ہوا ہے، یہ کام اگر نہ کیا گیا تو مستقبل میں بڑے خطرات درپیش ہوں گے جن کا مشاہدہ حال میں ہورہا ہے، اس صورت حال سے مقابلہ کرنے کے لئے مولانا کا مشورہ سنئے، طویل گفتگو کا صرف ایک اقتباس نقل کیا جاتا ہے!

یہ صرف ندوۃ العلماء ہی کا نہیں بلکہ عالم اسلام کا ایک بہت ہی اہم، مفید بلکہ انقلاب انگیز طرز عمل ہوگا مہم ہوگی کہ آپ ایک طرف

تو تعلیم یافتہ طبقہ سے احساس کہتری دور کریں، جو احساس کہتری ان کے اندر پیوست ہوگیا ہے وہ کہتے ہیں:

''ارے صاحب شکر کیجئے، آپ کیا بات کرتے ہیں، مسجد تو موجود ہیں، کوئی توڑتا نہیں، بابری مسجد کا قصہ تو الگ ہے، مدرسے بھی اپنا کام کررہے ہیں، عید کی نماز آزادی کے ساتھ ہوتی ہے، حج کو بھی جاتے ہیں، بس اسی پر قناعت کیجئے، یہ سوچئے کہ آپ کو کوئی موقع ملے قانون سازی کا، اور آپ کو نئے نظام تمدن کے پیش کرنے کا، کوئی اصلاحی مشورہ دینے کا، اس کا بالکل موقع نہیں ہے، تو اس چیز کو دور کرنے کی ضرورت ہے۔

وقت کا سب سے اہم فریضہ ہوگا کہ تعلیم یافتہ طبقہ سے احساس کہتری دور کیا جائے، مغربی تہذیب کا پول کھول دیا جائے، مغربی تہذیب کی جو حقیقت ہے وہ سمجھائی جائے کہ وہ ایک نفس پرستی اور جاہ پسندی ہے وہ ایک سطحیت ہے اور کچھ نہیں، اس کے لئے تیاری کی ضرورت ہوگی، مطالعہ کی ضرورت ہوگی، اس میں آپ ''اسلام ایٹ دی کراس روڈس'' محمد اسد کی کتاب، مولانا سید ابوالاعلی مودودی کی کتابیں اور مضامین جو انہوں نے شروع میں لکھے تھے، خود مجلس تحقیقات کی مطبوعہ کتابیں پڑھئے، اور خود پہلے اپنے ذہن ودماغ کو آزاد کیجئے مغربی تہذیب کے نئے تمدن اور نئی تہذیب کے اثر سے، اس کے اجلال، اس سے مرعوب ہونے کو دور کیجئے، پھر اس کے بعد اپنے اندر صلاحیت پیدا کیجئے، ذہنی طور پر عملی طور پر کہ آپ جدید تعلیم یافتہ طبقہ کو بھی متأثر کرسکیں، مطمئن کرسکیں کہ اب اس کا بھی زمانہ نکلنے والا ہے، اس کی روح پرواز کرنے والی ہے وہ ناکامی کی طرف بڑھ رہی ہے، کوئی رومی تہذیب تھی، کوئی یونانی تہذیب تھی، کوئی فرعونی تہذیب تھی، جیسے ان سب کا خاتمہ ہوگیا، اب اس کا بھی خاتمہ ہوگا، یہ بہت بڑا کام ہے، خاص طور سے اس شعبہ میں جو طلبہ ہیں اس سے تعلق رکھتے ہیں ان کے بنیادی فرائض میں ہے کہ ان دو چیزوں کی تیاری کریں، ایک احساس کہتری کو دور کرنے کے لئے علمی وفکری مدلل انداز میں، مغربی تہذیب کے تسلط کو، جو ذہنی مرعوبیت ہے اور دلوں میں مغربی تہذیب کی جو تقدیس بیٹھ گئی ہے اس کو دور کیا جائے، اس کے بغیر ہماری نسل کے تعلیم یافتہ طبقہ کا فکری طور پر اسلام کا گرویدہ ہونا اور اسلام کے عروج کے لئے کوشش کرنا ناقابل قیاس ہے۔'' (کاروان زندگی ج۔۷ص۹۹۔۱۰۰)

صرف نصابی کتابیں سمجھنا کافی نہیں

مدارس کی موجودہ صورت حال یہ ہے کہ ایک آدھ طلبہ کے بامقصد ہونے پر قناعت کرلی گئی ہے، تبلیغی ودعوتی اور تصنیفی وتحقیقی میدان میں پستی کے ساتھ تحریکی اور قائدانہ کردار میں جو کمی واقع ہوئی ہے وہ مخفی نہیں، ضرورت ہے کہ کام اور پیغام کو یاد رکھا جائے اور تجزیہ کرتے ہوئے آگے کا لائحہ عمل تیار کیا جائے:

''مدارس دینیہ کا کام صرف اتنا ہی نہیں کہ نصابی کتابیں سمجھ لی جائیں اور مسئلے مسائل بتادئے جائیں، ہم ان کی ناقدری نہیں کرتے، اس نظام تعلیم کا ہم احترام کرتے ہیں، اور اس کے داعی اور ذمہ دار ہیں، لیکن صرف اتنا کافی نہیں، موجودہ فتنوں کو سمجھنا ان سے اچھی طرح باخبر ہونا اور ان کا مؤثر وطاقت ور زبان اور دلکش اسلوب میں مقابلہ کرنا وقت کا بنیادی تقاضہ ہے، ہمارے طلبہ واساتذہ انگریزی اور کسی غیر ملکی زبان سے بھی واقف ہوں اور ان کے مآخذ سے فائدہ اٹھاسکیں اور ایسا لٹریچر تیار کریں جو جدید تعلیم یافتہ طبقہ کو متأثر کرسکے، ہمارے اساتذہ وطلباء کا مطالعہ وسیع، متنوع اور اپٹوڈیٹ ہو، ندوۃ العلماء نے عرب قوم پرستی اور علمانیت (سیکولرازم) کے خلاف جو زبردست محاذ قائم کیا تھا اور اس کے فرزندوں نے جس طرح پوری تیاری اور قوت کے ساتھ طاقتور اور مؤثر اسلوب میں اس فتنہ پر ضرب کاری لگائی تھی، اس کا عام طور پر عالم عربی میں اعتراف کیا گیا''۔ (کاروان زندگی ج۶ص ۲۶۵)

......**(جاری)**

☆☆☆

شخصیات

جسٹس مفتی محمد تقی عثمانی اور ان کی نظم ونثر

ندیم احمد انصاری
شعبۂ اردو، اسماعیل یوسف کالج، ممبئی، nadeem@afif.in

علومِ اسلامی اور تحقیقِ اسلامی میں سرگرداں اور اصلاح وتذکیر میں مشغول نیز نت نئے مسائل کی گتھیاں سلجھانے والے اور ملک و بیرونِ ملک کے دور دراز کے سفر کے لیے ہر دم پابہ رکاب رہنے والے جسٹس مفتی محمد تقی عثمانی نے اردو ادب کی حسین وادیوں کی بھی سیر کی ہے اور اپنے قلمِ معجز رقم سے چمنِ اردو میں خوبصورت گل بوٹے کھلائے ہیں، جنھیں اہلِ علم وفن نے دادِ تحسین سے نوازا ہے۔ آپ کے سفر نامے، شخصی خاکے، کتابی تبصرے اور مختلف اخبارات میں شائع ہونے والے کالموں نے آپ کی ادبی خدمات سے دنیا کو نہ صرف روشناس کروایا بلکہ آپ کے طرزِ تحریر اور رواں دواں قلم کی گلکاریوں کا شیدائی بھی بنایا ہے۔

جسٹس مفتی عثمانی کی پیدائش یوپی کی زرخیز سرزمین دیوبند میں 1943ء کو ہوئی، چار سال کی عمر میں اپنے والد ماجد مفسرِ قرآن مفتی محمد شفیع عثمانیؒ کے ساتھ پاکستان منتقل ہو گئے اور وہیں رہ کر والد کی نگرانی میں نہ صرف درسِ نظامی کی تکمیل کی بلکہ قرآن وحدیث اور فقہ اسلامی میں مہارت حاصل کی اور ساتھ ہی 1958ء میں پنجاب یونیورسٹی سے فاضلِ عربی کا امتحان امتیازی نمبرات سے پاس کیا۔ کراچی یونیورسٹی سے بی اے کیا، 1967ء میں ایل ایل بی کا امتحان دوسری پوزیشن کے ساتھ کامیاب کیا، اور ایم اے عربی میں پنجاب یونیورسٹی میں پہلی پوزیشن حاصل کی۔ انگریزی، اردو، اور عربی تینوں زبانوں میں بہ یک وقت کمال پیدا کر اب تک تینوں زبانوں میں درجنوں کتابیں تصنیف کر چکے ہیں۔ آپ 23 سال تک پاکستان شریعہ اپلیٹ بینچ آف سپریم کورٹ کے چیف جسٹس بھی رہے ہیں۔

جسٹس مفتی محمد تقی عثمانی نے جس گھرانے میں آنکھیں کھولیں، وہاں ہر طرف علم وتحقیق، شعر وادب کا خوش گوار ماحول تھا، والد ماجد مفتیِ اعظم پاکستان ہونے کے ساتھ ساتھ خوش اسلوب شاعر بھی تھے، جن کا شعری مجموعہ 'کشکول' کے نام سے شائع ہو چکا ہے اور بڑے بھائی ذکی کیفی بھی ممتاز شاعر تھے، جب کہ دوسرے بھائی ولی رازی نے سیرت پر نثر میں غیر منقوط ضخیم کتاب پیش کر لوگوں کو متحیر کیا۔ جسٹس عثمانی نے اپنی ادبی زندگی کی ابتدا ماہر القادری کے رسالے 'فاران' میں مضمون لکھ کر کی، جس کی بڑی پذیرائی ہوئی، پھر وقتاً فوقتاً اس رسالے میں آپ ادبی موضوعات پر لکھتے رہے، اور دارالعلوم کراچی کے مؤقر رسالے 'البلاغ' کے آپ کی زیرِ ادارت آ جانے کے بعد آپ کے ادبی جوہر کھل کر سامنے آنے لگے۔

بڑے بڑے ادبا سے آپ کے روابط رہے، آغا شورش کاشمیری سے آپ کی مراسلت رہی، پروفیسر حسن عسکری سے بھی آپ کے تعلقات رہے، جس کے متعلق ایک جگہ ادیبانہ طرز پر تحریر فرماتے ہیں:

''عسکری صاحب مرحوم کے ساتھ میرے تعلقات کی کہانی بھی عجیب ہے۔ بظاہر ہم دونوں کی دنیا ایک دوسرے سے بالکل الگ تھی، وہ اصلاً افسانوی ادب و شعر و تنقید کے آدمی تھے، اور میں شروع سے دین کا خشک طالبِ علم۔ وہ ادبی تحریروں کی وجہ سے ملک بھر میں مشہور اور میں بالکل گمنام۔ وہ شعر و ادب سے لے کر فلسفہ و سیاست تک ہر کوچے کی خاک چھانے ہوئے، اور میں سدا بسم اللہ کی گنبد میں گوشہ نشیں۔۔۔ چناں چہ آج سے گیارہ سال پہلے جب وہ میرے مکان پر تشریف لائے اور اپنا نام محمد حسن عسکری بتایا، تو ایک لمحے کے لیے تو ذہن اس محمد حسن عسکری کی طرف گیا جس کے تنقیدی شہ پاروں سے ادبی دنیا گونج رہی تھی''۔

علاوہ ازیں صاحبِ طرز ادیب اور صحافی مولانا عبدالماجد دریابادی سے بھی آپ کے قریبی مراسم تھے اور وہ آپ کے مضامین 'صدقِ جدید' میں قسط وار شائع کرتے تھے۔

جسٹس تقی عثمانی کی قلم کی رنگینی اور دل کشی کا سب سے بڑا مظہر آپ کے سفر نامے ہیں، جو بلاشبہ آپ کے ادبی ذوق و مزاج کی بہترین تصویر ہیں، جنھوں نے اردو ادب کی نئی روایتوں کو زندہ کیا اور بڑے ہی پرلطف انداز میں قارئین کو سفری ادب سے آشنا کیا ہے، جن میں ادب کی حلاوت و چاشنی، ذوق و جذبات کی تسکین اور تاریخ و جغرافیہ، حالات کا تجزیہ، اور درپیش مسائل کا حل وغیرہ سب ہی کچھ موجود ہے۔ جس کے کئی مجموعے 'جہانِ دیدہ'، 'دنیا میرے آگے' اور 'سفر در سفر' کے نام سے بار بار شائع ہوتے رہے ہیں اور جن پر سنٹرل یونیورسٹی آف حیدرآباد سے ڈاکٹر مجاہد علی نے ایم فل کی ڈگری حاصل کی ہے۔

شاعری اظہارِ بیان کا ایسا وسیلہ ہے جس کا جادو سب پر چھایا ہوا ہے۔ عالم ہو یا جاہل، دیہاتی ہو یا شہری، عامی ہو یا خاص' ہر ایک کو نثر و نظم میں آخر الذکر سے جو دل چسپی، یا نثر کے بالمقابل نظم کی اثر آفرینی کا احساس ہے، وہ ظاہر و باہر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فقہ و فتاویٰ جیسے خشک موضوع سے تعلق رکھنے والے اشخاص بھی اس سے خود کو بچا نہیں سکے، علمائے دین کی سوانح حیات پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے اکثر شعر و شاعری کا کچھ نہ کچھ ذوق ضرور رکھتے تھے۔ بعض کی مستقل بیاضوں اور مجموعوں نے شایع ہو کر پذیرائی بھی حاصل کی اور اکثر کی حیات کا یہ پہلو خود ان کی عدم توجہی کا شکار رہا۔

جسٹس مفتی محمد تقی عثمانی بھی اس سحر سے مسحور ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور گوناگوں ذمے داریوں اور مشغولیوں کے باوجود انھوں نے اپنے اندر رودیعت کی گئی شعری صلاحیتوں کو پہچان کر گاہ بہ گاہ شعر بھی کہے ہیں۔ شعر ملاحظہ ہو

آسی یہ غنیمت ہیں تیری عمر کے لمحے
وہ کام کر اب تجھ کو جو کرنا ہے یہاں آج

یہ معنی خیز شعر اُنھیں کا ہے، جس میں زندگی کی اہمیت کا احساس دلایا گیا ہے۔ یعنی نثر میں قیمتی شہ پاروں کو پیش کرنے کے ساتھ ساتھ انھوں نے نظم میں بھی اپنے قلبی احساسات اور شوق و جذبات کا اظہار بہت خوبصورت انداز میں کیا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ جب دیگر متنوع علمی مصروفیات سے چُور ہو کر فرصت کے لمحات پاتے ہوں گے، اس وقت اس لطیف مشغلے کو اپناتے ہوں گے۔

ان کی شاعری کا موضوع عشقِ حقیقی ہے اور بہ اعتبارِ اصناف انھوں نے حمد، مناجات، نعت، مرثیے اور غزلوں میں طبع آزمائی کی ہے۔ ان کے بہت سے اشعار زبان زدِ خلائق رہتے ہیں۔ ان کے کلام میں اسلامی تلمیحات اور سادہ و شستہ زبان کا استعمال ہوتا ہے، جو تصنع سے پاک ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حج کے موقع پر جب وہ ملتزم پر حاضر ہوئے' جو کہ مقامِ اجابتِ دعا ہے، تو کئی بند فی البدیہہ ان کی زبان پر جاری ہو گئے، جن میں لطافتِ زبان اور اظہارِ بیان کا بہترین نمونہ موجود ہے۔ بہ طور مثال فقط ایک بند ملاحظہ ہو

سرگشتہ و در ماندہ بے ہمت و ناکارہ
وارفتہ و سرگرداں بے مایہ و بے چارہ
ہرسمت سے غفلت کا گھیرے ہوئے اندھیارا
آج اپنی خطاؤں کا لادے ہوئے پشتارا
دربار میں حاضر ہے اک بندۂ آوارہ

یہ سچ ہے کہ شعروشاعری کبھی ان کا مستقل مشغلہ نہ بن سکی اور علومِ اسلامیہ ان کی خدمات کا محور رہے، اس کے باوجود صاف ستھرا شعری ذوق انھیں وراثت میں ملا ہے، جیسا کہ پہلے عرض کیا کہ ان کے والد جو کہ مفتیِ اعظم پاکستان کی حیثیت سے معروف ومشہور ہیں، خود صاحبِ مجموعہ شاعر تھے، ان کے بڑے بھائی نے بھی اس میدان میں دادِ تحسین حاصل کی اور اب بھتیجے مسعود عثمانی' جن کے متعدد شعری مجموعے بہ نام بارش، جل پری اور قوس شائع ہو چکے ہیں، اس راہ کے ممتاز مسافر ہیں۔ مسعود عثمانی کا بیان ہے کہ 'اگر وہ (یعنی جسٹس عثمانی) شاعری کو اپنی علمی تگ ودو کا مرکز بناتے، تو بڑے بڑوں کا چراغ نہ جلتا'۔

مختصر یہ کہ جسٹس عثمانی نہ صرف اچھی شاعری کرتے ہیں، بلکہ شعرگوئی کے متعلق پختہ اور ٹھوس رائے بھی رکھتے ہیں۔ ان کا اعتقاد ہے:

'شعر انسانی جذبات کے اظہار کا مؤثر ترین ذریعہ ہے اور انسانی جذبات میں بھی جذبۂ محبت کے اظہار کے لیے شعر کی زبان سب سے زیادہ موزوں ہے، بلکہ اگر یہ کہا جائے تو شاید مبالغہ نہ ہو کہ شعر کا اصل موضوع ہی محبت ہے۔ اصل بات تو یہ ہے کہ حسن وعشق کی وہ لطیف کیفیات جو دل کے نہاں خانوں میں پرورش پاتی ہیں، ان کا تعلق احساس وادراک سے ہوتا ہے اور اکثر اوقات الفاظ کا لباس ان پر پوری طرح فٹ نہیں ہو پاتا بلکہ بعض اوقات الفاظ کا بوجھ ان کی نزاکت کو کچل کر رکھ دیتا ہے۔۔۔ لیکن اس بے نام کیفیات کی بھی اگر کسی درجے میں کوئی تعبیر ممکن ہے، تو اس کا لطیف ترین ذریعہ شعر ہی ہے اور اسی لیے شعر اور محبت کا ہمیشہ چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔ (نعت النبی نمبر، ندائے شاہی، ص: 157-156)

البتہ انھوں نے عشق کو حقیقی ومجازی دو خانوں میں منقسم کرا پنے لیے عشقِ حقیقی پسند فرمایا ہے اور اسی کی ترغیب دی ہے، جیسا کہ لکھتے ہیں:

''پھر عشق ومحبت بھی دو قسم کا ہے، ایک وہ جسے عشقِ مجازی سے تعبیر کیا جاتا ہے اور دوسرا وہ جسے عشقِ حقیقی کہتے ہیں۔ پہلے کا تعلق مخلوق سے ہے، دوسرے کا خالق سے۔ پہلے میں بہ ظاہری جوش و خروش زیادہ ہوتا ہے، لیکن پائے داری کم، اور دوسرے میں عموماً ٹھہراؤ ہوتا ہے، لیکن پائے داری بہت۔ پہلا اکثر مرورِ ایام سے دھیما پڑ جاتا ہے اور دوسرے میں مرورِ ایام سے پختگی آتی جاتی ہے۔ پہلے کا منتہائے مقصود وصال ہے اور دوسرے کا مقصود رضائے دوست [خدا]، پہلے کا تعلق صفات سے ہے اور دوسرے کا تعلق ذات سے، اس لیے پہلی قسم کا عشق اکثر ہوس کی سرحدوں کو چھونے لگتا ہے اور دوسری قسم کا عشق ہوس سے کوسوں دور ہے اور چوں کہ عشق درحقیقت وہی ہے جو ذات سے ہو، جس کا مقصود رضائے دوست ہو اور جو مرورِ ایام سے دھیما نہ پڑے، اس لیے دوسری قسم کا عشق ہی عشقِ حقیقی ہے اور پہلی قسم کو محض مجازاً عشق سے تعبیر کر دیا جاتا ہے، ورنہ حقیقت میں وہ عشق ہے ہی نہیں۔۔۔ لہٰذا عشق حقیقت میں وہی ہے جو اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہو اور عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم بھی درحقیقت مخلوق ہونے کی حیثیت سے نہیں، بلکہ اس حیثیت سے ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم خالق تک پہنچنے کا لازمی واسطہ ہیں''۔ (نعت النبی نمبر، ندائے شاہی، ص: 157-156)

یہی وجہ ہے کہ جسٹس عثمانی کے یہاں جو اشعار ملتے ہیں وہ اکثر

حمد و مناجات اور نعت کے ہیں اور ان کی جو غزلیں ہیں، وہ بھی اسی عشقِ حقیقی سے معمور ہیں۔ اس لیے کہ ان کا محبوب گوشت پوست کا انسان نہیں، جو ناپائیدار ہے، بلکہ خالقِ کائنات ہے جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ اس لیے ان کے اشعار کو عشقِ مجازی پر محمول کر کے صحیح معنی میں نہیں سمجھا جا سکتا۔

بہ طور مثال ان کا ایک عمدہ شعر ہے۔

سچ سچ کہوں کہ ہجر کی تاریک رات میں
ایسی بھی کوئی پل تھی کہ تجھ سے جدا تھا میں

یہ خالص عشقِ حقیقی پر مبنی وہ کیفیت ہے جس کا مطلوب ہونا ظاہر ہے۔ یہ وہ عرفان اور فیضِ عارفی ہے، جو انھوں نے اپنے مرشد ڈاکٹر عبدالحیٔ عارفی کی صحبت و تربیت سے پایا ہے۔ جیسا کہ وہ دعا گو ہیں۔

مجھے تیری جستجو ہو میرے دل میں تو ہی تو ہو
میرے قلب کو وہ فیضِ درِ عارفی عطا کر

مختصر یہ کہ عشقِ حقیقی ہی ان کا اصل موضوع ہے اور وہ اسی میں کھو کر اشعار کو ضبط و تحریر میں لانا پسند کرتے ہیں، لیکن ان کی شاعری میں حیاتِ انسانی کے موضوعات بھی ہیں، جس میں وہ قاری کو ایسا پیغام دیتے ہیں، جو تجربے و تدبر کا نتیجہ ہوتا ہے۔ دیکھیے کس سہل انداز میں گویا ہیں۔

گرمیِ گفتار سے جب کچھ نہ حاصل ہو سکے
بے زبانی کی زباں بھی آزما کر دیکھیے

آج انسانی معاشرے میں کسی کو اپنی بات سمجھانے بلکہ منوانے کا موثر طریق گرمیِ گفتار کو سمجھا جاتا ہے کہ جب گفتگو کی جاتی ہے تو نرم انداز میں ابتدا ہوتی ہے اور جب مخاطب اسے ماننے میں پس و پیش کرتا ہے تو گرمیِ گفتار کے ذریعے اسے زیر کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، لیکن جسٹس عثمانی نے اس کا علاج زبانِ بے زبانی کو بتایا ہے، جو کہ انتہائی پختہ عمر میں جا کر سمجھ میں آتا ہے۔

جسٹس عثمانی کے کلام میں جمود نہیں بلکہ حرکت ہے، کیوں کہ حرکت ہی زندگی ہے۔ جو خوفِ حوادث کی بنا پر قطعِ راہ سے گریزاں ہیں، ان سے گویا ہیں۔

قدم ہیں راہِ الفت میں تو منزل کی ہوس کیسی
یہاں تو عینِ منزل ہے تھکن سے چور ہو جانا

موصوف کے کلام میں ظاہری خصوصیات بھی نمایاں ہیں، انھیں تلمیحات، تشبیہات اور استعارات وغیرہ کو برتنے کا فن کارانہ بلکہ استادانہ ملکہ حاصل ہے، بہ طور مثال فقط ایک شعر ملاحظہ فرمائیں۔

بسا لینا کسی کو دل میں دل کا کلیجا ہے
پہاڑوں کو تو بس آتا ہے جل کر طور ہو جانا

اس شعر میں طور کی وہ تلمیح جو سیکڑوں شاعروں نے استعمال کی ہے، ایک گونا جدت لیے ہوئے ہے، علاوہ ازیں 'دل کا کلیجا' تو ایسی ترکیب ہے جو کمالِ فن اور مہارتِ فن پر دال ہے۔

حاصل یہ کہ جسٹس عثمانی سادہ و شستہ اسلوب میں مافی الضمیر کو ادا کرنے میں کامیاب ہیں، جو شعر کی خوبصورتی کا باعث ہے۔ ان کے ہاں شوکتِ الفاظ اور بے جا رکھ رکھاؤ سے کلام کو دقیق نہیں بنایا جاتا اور نہ ہی عربی و فارسی پر غیر معمولی قدرت کے باوجود ان کے غیر مانوس الفاظ کو کلام میں ٹھونس کر کسی پر رعب ڈالنے کی کوشش کی جاتی ہے اور اس طرح ان کے کلام میں ظاہری و معنوی خوبیوں کے ساتھ ذہنی بلکہ روحانی آسودگی کا سامان موجود ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کی نظم و نثر کو باقاعدہ تحقیق کا موضوع بنا کر اس میں ادبی جواہر پارے تلاش کرنے کی کوشش کی جائے۔

☆☆☆

تعارف و تبصرہ

نام کتاب: دانشِ راہ بین (نذرِ پروفیسر عبدالرحیم قدوائی)

مرتب: محمد حارث بن منصور

تبصرہ نگار: ڈاکٹر محمد طارق ایوبی

ناشر: براؤن بک پبلی کیشنز، نئی دہلی

۲۹۶ صفحات پر مشتمل یہ مجموعۂ مضامین "دانش راہ بین" اپنے نام کی جدت ورعنائی کے ساتھ ہمارے عہد کے ایک ایسے دانشور کو نذر کرنے کے لیے مرتب کیا گیا ہے، جس کی زندگی جہد مسلسل، عملِ پیہم اور محبت کی فاتحانہ شان سے معمور ہونے کے سبب مثالی ہے، جس نے فی الحقیقت تلاش وجستجو اور راہ بینی ورہنمائی کے لیے عقل سلیم کے بہتر استعمال کا طریقہ سیکھا اور سکھایا ہے، جو وسائل کے بہترین استعمال، خیر کے حصول، شخصیت کی تعمیر، دین ودنیا کے توازن، راسخ العقیدگی اور فکر اسلامی کی نمائندگی میں ممتاز ہے، یہ نمایاں شخصیت مشہور مفسر قرآن مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کے نواسے، پروفیسر عبدالرحیم قدوائی کی ہے، جنھوں نے ساٹھ سالہ زندگی میں اپنی شناخت ایک کامیاب استاد، ایک شفیق مربی، معتدل فکر کے حامل دانشور، انگریزی کے باکمال ادیب، مترجم قرآن اور علوم القرآن کے شناور کے طور پر بنائی ہے، اگر چہ ہمارے برصغیر میں شخصیت شناسی اور احسان شناسی بالعموم بعد از مرگ ہوتی ہے، جب سننے والا نہیں رہتا تو مدح وستائش کی محفلیں سجائی اور گرمائی جاتی ہیں، لیکن خوش نصیب کہ عرصہ سے ہمارے علمی معاشرے میں اعلی ترین علمی وتعلیمی خدمات کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے رسائل کے خاص نمبرات اور خصوصی مجموعہائے مضامین نذر کرنے کی خوبصورت روایت چلی آرہی ہے، جو کسی بھی شخصیت کے اعتراف، اس کی خدمات پر خراج تحسین پیش کرنے اور اسکی حوصلہ افزائی کرنے کا بہترین وباوقار طریقہ ہے، روشِ عام سے ہٹ کر اگر ان مجموعوں میں شامل تاثراتی مضامین میں مثبت تنقید کا پہلو بھی شامل ہو تو راقم کی نظر میں ممدوح کی بقیہ زندگی کے لیے یہ بھی ایک احسان سے کم نہ ہوگا، کیونکہ فرصتِ احتساب مل جانا بھی کسی نعمت سے کم نہیں، لیکن اس مشینی مصروفیت کے دور میں کسے فرصت! جو کچھ ہو جائے وہی بہتر ہے۔"دانشِ راہ بین" اس زریں سلسلہ کی ہی ایک حسین کڑی ہے جو ہر طرح کی ظاہری و باطنی خوبصورتی سے آراستہ ہے، اس مجموعہ کا ممدوح ظاہری وجاہت اور نسبی و خاندانی وقار سے بھی سرفراز ہے، علمی دنیا اس کی اصابت رائے اور سلیم الفکری کی بھی معترف ہے، اور اس کی علمی فتوحات نے اسے انفرادی شناخت عطا کی ہے، مجموعہ کے مرتب عزیزم حارث بن منصور کی فرض شناسی کا راقم خود شاہد ہے مگر انھوں نے اپنی احسان شناسی کا پختہ ثبوت یہ مجموعہ مرتب کر کے دیا ہے، اس کے قلم کاروں میں معروف ومشہور اہل علم کی شرکت نے اس کے وقار ومعیار میں اضافہ کیا ہے۔

پروفیسر قدوائی کو نذر کیا گیا یہ مجموعہ مضامین تین جہتوں پر مشتمل ہے، اس کے پہلے حصے میں اسلامیات وادبیات پر مشتمل مضامین ہیں، جبکہ دوسرا حصہ پروفیسر قدوائی کی شخصیت وخدمات کے تناظر میں تاثراتی نگارشات پر مشتمل ہے، کتاب کا تیسرا حصہ جو اگر چہ سب سے مختصر ہے مگر راقم سطور کی نظر میں سب سے اہم ہے، کیونکہ اس حصے میں عزیزم مرتب نے بڑی عرق ریزی سے پروفیسر قدوائی کی تصنیفات، ان کے مقالات و مضامین کی ببلیوگرافی تیار کر کے پیش کیا ہے۔

کتاب کی ابتدا مرتب کے پیش لفظ سے ہوتی ہے، جو ایک طرح سے اس کتاب کا تعارف بھی ہے اور مرتب کا شکر وسپاس بھی، اختصار و جامعیت اس کی خوبی ہے مگر بعض لفظیات کے استعمال و کتابت میں راقم کو اگر تأمل ہوا تو یہ کوئی قابل تعجب بات نہیں، اس پیش لفظ سے پہلے پروفیسر قدوائی کی ایک سادہ سی تصویر شامل کتاب کی گئی ہے، جو موصوف کی سادگی،

وضع داری، ذہانت اور رواداری کی عکاس نظر آتی ہے۔

کتاب کا پہلا حصہ ''اسلامیات وادبیات'' پر مشتمل ہے، اس حصے میں گیارہ مقالات ومضامین شامل ہیں، پہلا مقالہ برصغیر کے معروف سیرت نگار اور تاریخ اسلامی کے مشہور خدمت گزار عالم باوقار وضعدار مولانا پروفیسر یٰسین مظہر صدیقی ندوی صاحب کا ہے، کہا جا سکتا ہے کہ اس مجموعہ میں ان کی قلمی شراکت نے اس مجموعہ کو رشک آسمان بنا دیا ہے، ان کا یہ مقالہ شبلی کی سیرۃ النبی میں نقد مصادر (ایک جامع درایتی مطالعہ) کے عنوان سے شامل کتاب ہے، جس میں صاحب مقالہ نے انتہائی معروضی اور علمی انداز میں مصادر سیرت پر علامہ شبلی کی تنقیدوں کا جائزہ لیا ہے۔

اس کے علاوہ مختلف موضوعات پر مشہور قلم کاروں اور دانشوروں کے مقالے ہیں جن میں قابل ذکر پروفیسر ظفر احمد صدیقی، پروفیسر عبید اللہ فہد فلاحی، پروفیسر اختر الواسع، مولانا نذیر احمد ندوی، ڈاکٹر ضیاء الدین فلاحی وغیرہ ہیں، خود مرتب کا ایک اہم مضمون بھی بعنوان ''صلح حدیبیہ اور ہندوستانی مسلمان'' شامل ہے، جس میں مقالہ نگار نے ہندوستانی مسلمانوں کی موجودہ صورتحال کے تناظر میں صلح حدیبیہ سے استدلال و استنتاج کی بہترین کوشش کی ہے اور قارئین کے لیے اچھے سوالات قائم کیے ہیں، لیکن یہ سوال پھر بھی باقی رہ جاتا ہے کہ ہندوستانی مسلمان کب تک مکی زندگی اور صلح حدیبیہ کو پیش نظر رکھیں اور پھر کیا واقعی ہماری تنظیمیں اور تحریکیں اس استدلال کے نتیجے میں اس مجاہدہ، جہاد بالقرآن اور کار دعوت کے لیے وہ تگ ودو کر رہی ہیں جس کا مکی زندگی میں حکم دیا گیا، اور جو مکی زندگی کا امتیاز ہے، جو عہد سیرت نبوی اور سیرت اصحاب کا امتیاز تھا اور جس کی کوکھ سے ریاست مدینہ نے جنم لیا تھا، صلح حدیبیہ کو اس نظر سے بھی دیکھنا چاہئے کہ قرآن نے اسے ''فتح'' سے تعبیر کیا ہے اور یقیناً وہ فتح مکہ کی تمہید تھی، سیرت کے تمام واقعات باہم مربوط ہیں، مکی زندگی، ہجرت، صلح حدیبیہ اور مدنی زندگی میں سے کسی ایک کو موضوع بنایا جائے تو دیگر پہلوؤں کو ضرور ملحوظ رکھا جائے تب ہی استنتاج مکمل ہوگا اور افادۂ سیرت عام ہوگا، ظاہر ہے کہ اب سیرت کے روایتی مطالعہ وپیشکش سے آگے بڑھ کر اس کی عصری معنویت اور استدلال واستفادے کے لیے مطالعہ کرنا ضروری ہے، جس کی طرح علامہ شبلی اور ان کے فاضل شاگرد علامہ سید سلیمان ندویؒ نے ڈالی تھی، خوشی کی بات ہے کہ مرتب نے اسی انداز کی یہ کوشش کی ہے۔

اس حصے میں پروفیسر ابو سفیان اصلاحی نے پروفیسر قدوائی کی تصنیف ''مستشرقین اور انگریزی تراجم قرآن'' کا جائزہ پیش کیا ہے، اسی طرح ڈاکٹر حیات عامر حسینی نے ''پروفیسر قدوائی بحیثیت مترجم قرآن'' کے عنوان سے ایک بیش قیمت مقالہ تحریر کیا ہے، مولانا نعیم الرحمٰن صدیقی نے ''پروفیسر قدوائی کا اسلوب نگارش، چند نمونے'' لکھ کر کتاب کو نئی جہت دی ہے، کتاب کے اس حصے میں شامل یہ تینوں مقالے پروفیسر قدوائی کی اقلیم علمی وادبی کا بھرپور تعارف پیش کرتے ہیں۔

کتاب کے دوسرے حصے ''تاثراتی نگارشات'' میں چھ مضامین شامل ہیں، پروفیسر حکیم سید ظل الرحمٰن نے پروفیسر قدوائی کی شخصیت کا مطالعہ پیش کیا ہے، پروفیسر توقیر عالم فلاحی نے پروفیسر قدوائی کو نابغۂ روزگار شخصیت تسلیم کرتے ہوئے اپنے تاثرات قلم بند کیے ہیں اور معروضی انداز میں اپنے قائم کردہ عنوان کے دلائل فراہم کیے ہیں، پروفیسر غضنفر کا عنوان ''کج کلاہی کا بانکپن'' بڑا لطیف اور دل کو لگتا ہوا ہے، مضمون نگار نے جس طرح کج کلاہی کی شرح کی ہے اس پر قاری داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا، پروفیسر قدوائی کی کج کلاہی کی شرح کرتے ہوئے مقالہ نگار نے ان کی شخصیت کی مکمل ودلآویز تصویر کشی کا کام کیا ہے، ان کی خاکہ نگاری مشہور ہے، تو اس کی شہرت کا اثر خود اس جگہ صاف نظر آیا، ان کی وصف نگاری کا یہ انداز بھلا معلوم ہوا، البتہ اس مضمون میں ٹوپی و داڑھی اور شیروانی کے باعث مولویوں کی شباہت رکھنے والے پروفیسر قدوائی کی شان امتیازی کو بیان کرنے کے لیے مولویوں، اماموں اور مدارس کے مدرسوں کے استخفاف کا پہلو نمایاں ہو گیا ہے، مجھے نہیں معلوم کہ یہ عمل شعوری طور پر انجام پایا ہے یا غیر شعوری کا نتیجہ ہے، جو بھی ہو مگر اتنی بات طے ہے کہ یہ استخفاف اس فکری افلاس کا نتیجہ ہے جو مغرب کی مرعوبیت سے اچھے اچھے لوگوں کا پیچھا نہیں چھوڑتا، مجھے یہاں کسی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں، مگر اتنا عرض کر دینا ضروری ہے کہ سیرت و تاریخ اور اسلامیات کے باب میں ان بوریہ نشینوں اور ظاہر میں نظر آنے والے فقیروں نے جو قابل فخر سرمایہ فراہم کر دیا ہے اس کی مثال پیش

کرنے سے یونیورسٹیاں قاصر رہی ہیں بلکہ ان بے چاروں کی کتابیں بہت سے اسکالروں کو روزی روٹی کا سامان فراہم کرتی ہیں، یہی نہیں بلکہ اس تفریق و انداز فکر نے یونیورسٹیوں کے شعبہائے اسلامیات کو استشراق کا مرکز اور مستشرقین کی ہرزہ سرائیوں کو پنپنے کا اڈہ بنا دیا، بقول پروفیسر ظلی صاحب کہ مستشرقین کو جو کرنا تھا کر گئے مگر وہ اپنے وارث اسلامک اسٹڈیز کے شعبوں میں چھوڑ گئے، اب ان کا کام ہمارے اپنے لوگ کرتے ہیں، فکر اسلامی اور مولویت سے ہٹ کر صرف انگریزی کا غرہ اور انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کو مرجع بنا کر اسلام کو سمجھنے کی کوشش ایسے ہی گل کھلاتی ہے، بہر حال کہنے کو تو یہ جی چاہتا ہے کہ انگریزی جب ایسے ہی ٹوپی داڑھی والے بظاہر مولوی نما انسان کے ہاتھ آتی ہے تو قرآن کی خادم اور اسلام کی تبلیغ کا ذریعہ بن جاتی ہے، اس ضمن میں بہت سے نام پیش کیے جا سکتے ہیں، مگر صرف یہ کہنا ہی کافی ہے کہ پروفیسر قدوائی کی شخصیت خود اس پر شاہد ہیں اور ان کے نانا محترم کا نام اس دعوے کے لیے سند کا درجہ رکھتا ہے۔

بہر حال یہ تو جملۂ معترضہ تھا، آگے اس حصہ میں پروفیسر صغیر افراہیم کا مقالہ ہے جنہوں نے بڑے دلنشیں اسلوب اور شستہ زبان میں پروفیسر قدوائی کی علمی وثقافتی جہتوں پر روشنی ڈالی ہے، پروفیسر لطیف حسین شاہ کاظمی نے مشاہدات اور تاثرات لکھ کر پروفیسر قدوائی کو خراج عقیدت پیش کیا ہے، آخری مضمون اس حصہ میں ڈاکٹر ابرار احمد قاسمی کا ہے جنہوں نے پروفیسر قدوائی کی شخصیت کو پیش کرنے کے لیے واقعی بے حد معنی خیز مصرع کو عنوان بنایا ہے، ''مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہے آفاق'' ڈاکٹر ابرار نے مبالغہ آرائی سے بچتے ہوئے اپنے مختصر سے مضمون میں پروفیسر قدوائی کی شخصی خصوصیات، مربیانہ صفات اور ان کے خلوص و للّٰہیت کو بڑے سلیقہ سے قلم بند کیا ہے۔

کتاب کا تیسرا حصہ انتہائی اہمیت کا حامل ہے جس کی ترتیب و پیش کش کے لیے عزیزم مرتب ہم سب کی طرف سے شکریہ کے مستحق ہیں۔

اس تیسرے حصہ میں انھوں نے پروفیسر قدوائی کی اردو انگریزی تصنیفات اور مضامین ومقالات کی مرتب ببلیو گرافی پیش کر دی ہے، یقیناً اس کے لیے انھوں نے بڑی تگ ودو کی ہوگی کیوں کہ ان قیمتی معلومات کو یکجا کر دینا بڑا علمی کام ہے، کتاب کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ پروفیسر قدوائی صحیح معنی میں اپنے نانا کے اخلاق وکردار اور ان کی علمی وادبی وراثت کے امین ہیں، سلامت فکری اور جودت طبع ان کے حصے میں آئی ہے، ان کی علمی کاوشوں کا محور قرآن مجید، اس کے علوم اور اس سے متعلق مستشرقین کی فتنہ سامانیوں کا استیصال ہے، انگریزی ادب تو ان کا اپنا موضوع ہے، اقبال بھی ان کے قلمی اور فکری سفر میں رچے بسے نظر آتے ہیں، انگریزی پر اپنی قدرت ومہارت سے بھی پروفیسر قدوائی نے اسلام کی بڑی خدمت کی ہے، وہ ایک باکمال وکامیاب مترجم ہیں، میرا خیال ہے کہ انھوں نے جن علماء کی تصنیفات کو انگریزی میں منتقل کیا ہے یا جن کا ترجمہ ان کی نگرانی میں انجام پایا ہے اس مجموعہ میں ان کا ذکر رہ گیا ہے، بہر حال ہم پروفیسر قدوائی کی شخصیت وخدمات کا بھر پور تعارف پیش کرنے والی اس کتاب پر عزیز القدر حارث سلمہ کے مشکور ہیں کہ انھوں نے نہ صرف اپنے استاذ کو بروقت خراج عقیدت پیش کرنے کا اہتمام کیا بلکہ ساتھ ہی اہل علم کے لیے بہترین علمی غذا کا سامان بہم کیا، بات چل نکلی تھی پروفیسر قدوائی کی کج کلاہی کی تو ہم بھی انہیں اور ان کی کج کلاہی کو یہ کہہ کر داد وخراج پیش کرتے ہیں۔

سبھی اندازِ حسن پیارے ہیں
ہم مگر سادگی کے مارے ہیں

☆☆☆

نام کتاب: اتالیق بی بی (ایک تعارف-ایک جائزہ)
مصنف: چودھری محمد علی ردولوی
مرتب: ڈاکٹر انور حسین خاں
صفحات: ۸۸؛ قیمت: ۵۰
سال اشاعت: ۲۰۱۷ء
ناشر: مرکز ثقافت وتحقیق، علی گڑھ
مبصر: ڈاکٹر محمد فرقان سنبھلی،
(ویمنس کالج، اے ایم یو، علی گڑھ۔9411808585)

چودھری محمد علی ردولوی کا شمار اردو کے صاحب طرز نثر نگاروں میں

کیا جاتا رہا ہے۔ چودھری محمد علی ردولوی کا تعلق تاریخ ساز اور مردم خیز قصبہ ردولی سے تھا، یہ وہ قصبہ ہے جس سے نجم آفندی، مجاز لکھنوی جیسی بلند و بالا شخصیات کا نام منسوب ہے۔ چودھری محمد علی ردولوی نے متعدد کتابیں تحریر کیں، جن میں ''اتالیق بی بی''، ''کشکول محمد علی شاہ فقیر''، ''گناہ کا خوف'' وغیرہ اہمیت کی حامل مانی جاتی ہیں۔ معروف نقاد ڈاکٹر شارب ردولوی نے چودھری محمد علی ردولوی کی علمی اور ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے 'اتالیق بی بی' کے جدید ایڈیشن میں لکھا ہے کہ:

''وہ ملک میں پہلے شخص تھے جنھوں نے ''فیملی پلاننگ'' پر کتاب لکھی اور اپنی بیٹی اور بہو کے نام معنون کی، نوجوانوں کو جنسی بے راہ روی سے روکنے کے لئے 'صلاح کار' نام کی کتاب تحریر کی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ان موضوعات پر لوگ بے تکلف محفل میں بھی گفتگو نہیں کرتے تھے''۔ (ص ۵)

ڈاکٹر شارب ردولوی نے چودھری محمد علی ردولوی کی پہلی کتاب ''اتالیق بی بی'' کو مانا ہے جو کہ ۱۹رویں صدی کے آخر یا ۲۰رویں صدی کے ابتدائی زمانے کی تحریر مانی جاتی ہے۔ ''اتالیق بی بی'' میں چودھری محمد علی ردولوی نے خانگی زندگی کے ۱۴رمختلف قصوں کو شوہر اور بیوی دو کرداروں کے ذریعہ پیش کیا ہے۔ کسی ایک یا دو کرداروں کے ذریعہ کسی ایک کردار پر یا کسی ایک کردار کو موضوع بنا کر متعدد قصے لکھنے کا رواج اس وقت تک نہیں ہوا تھا۔ پاکستان کے نقاد و محقق مرزا حامد بیگ نے چودھری محمد علی ردولوی کو ابتدائی افسانہ نگاروں میں شامل کرنے سے انکار کیا ہے اور لکھا ہے کہ:

''اب صرف ایک نام رہ جاتا ہے اور وہ ہے محمد علی ردولوی کا نام۔ انھوں نے بلاشبہ افسانہ نگاری کا آغاز یلدرم اور پریم چند کے ساتھ کیا لیکن ادبی جرائد تک رسائی نہ ہونے کے سبب اشاعت میں تاخیر ہوئی''۔ (تنقید، شعبہ اردو اے ایم یو، شمارہ-۱، ص ۲۰)

مرزا حامد بیگ نے ان کے کسی افسانے کو پہلے دس افسانوں میں شمار نہیں کیا ہے حالانکہ ڈاکٹر شارب ردولوی نے لکھا ہے کہ:

''جہاں تک ان کی افسانہ نگاری کا تعلق ہے مشہور فکشن ناقد مرزا حامد بیگ انہیں اردو کا اولین افسانہ نگار ماننے پر اصرار کرتے ہیں''۔ (ص ۵)

ڈاکٹر شارب ردولوی کے مذکورہ بالا قول سے اتفاق نہیں کیا جاسکتا کیوں کہ انھوں نے اپنی فہرست میں محمد علی ردولوی کو شامل نہیں کیا ہے۔ جہاں تک اتالیق بی بی کا تعلق ہے تو اس کی صنف کا تعین قدرے مشکل امر ہے۔ کہا جاتا ہے کہ 'اتالیق بی بی' انگریزی کتاب ''کریٹن پکچرز'' سے تحریک پاکر لکھی گئی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ چودھری محمد علی نے ''اتالیق بی بی'' میں چودہ قصوں کو ہندوستانی فضا میں ہندوستانی کرداروں کے ذریعہ اس طرح پیش کیا ہے کہ موضوع کے علاوہ ''کریٹن پکچرز'' سے اس کا کوئی تعلق باقی نہیں بچتا۔

''اتالیق بی بی'' چودھری محمد علی ردولوی کے زمانہ حیات میں ہی نایاب ہوگئی تھی۔ اس دلچسپ تحریر کے مطالعہ کے لیے کوئی نسخہ موجود نہیں تھا۔ ڈاکٹر انور حسین خاں جن کا خود تعلق بھی ردولی قصبے سے ہے، نے ''اتالیق بی بی'' کے جدید ایڈیشن کو مرتب کیا ہے جس کی اشاعت ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی کی کوششوں کے سبب مرکز ثقافت و تحقیق علی گڑھ نے حال ہی میں کی ہے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی نے لکھا ہے کہ شرر صاحب کی فرمائش پر محمد علی ردولوی نے یہ کتاب تحریر کی تھی جو کہ ان کی پہلی کتاب بھی ہے۔ (ص ۱۱) تلاش بسیار کے باوجود کتاب کا پہلا ایڈیشن ڈاکٹر انور حسین خاں کو جب نہیں مل سکا تو انھوں نے اردو اکیڈمی سندھ کراچی پاکستان سے ۱۹۸۰ء میں شائع شدہ متن سے رجو کیا۔ زیر تبصرہ کتاب کا متن اکیڈمی کے شائع کردہ متن سے مستعار لیا گیا ہے۔ پیش لفظ ڈاکٹر شارب ردولوی کا شامل اشاعت ہے اور ڈاکٹر طارق ایوبی ندوی اور ڈاکٹر انور حسین خاں مرتب کتاب کے مضامین کی اشاعت کے علاوہ مشکل الفاظ کی فرہنگ بھی شامل کی گئی ہے۔ جس سے نئی نسل کو قدیم متن کے مطالعہ میں دقتیں پیش نہ آئیں۔

مرتب ڈاکٹر انور حسین خاں نے اپنے تعارفی جائزے میں یہ وضاحت کی ہے کہ ''خاکہ ایک انگریزی کتاب ''کریٹن پکچرز'' سے ماخوذ ہے لیکن چودھری صاحب نے اپنی جولانی طبع سے اس میں وہ خوبیاں پیدا کی ہیں جس کے سبب یہ کتاب ان کی اپنی طبع زاد معلوم ہوتی ہے''۔ (ص ۱۳)

وہ مزید لکھتے ہیں کہ:

''اتالیق بی بی'' کی خاکہ نگاری میں اس خیال کو پیش نظر رکھا گیا ہے کہ ایسی مشرقی عورت کو پیش کیا جائے......'' (ص ۱۳)

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ''اتالیق بی بی'' درحقیقت خاکوں کا مجموعہ ہے۔ لیکن مرزا حامد بیگ اور ڈاکٹر شارب ردولوی نے اس کو صنف افسانہ نگاری سے جوڑ کر دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ یہاں تک کہ دونوں معروف قلم کاروں نے چودھری محمد علی ردولوی کو پریم چند سے پہلے کے افسانہ نگار کے طور پر تسلیم کیا ہے، جبکہ ''اتالیق بی بی'' کے متن کو پڑھنے کے بعد اس کو افسانہ ماننے میں تردد ہوتا ہے۔ بیشک جس زمانے میں یہ لکھا گیا اس وقت افسانہ کا کوئی نمونہ ان کے سامنے نہیں تھا اس لیے انھوں نے جو دلچسپ تحریر پیش کی ہے اسے ابتدائی نقوش کے طور پر اہمیت دی جا رہی ہے۔ ''اتالیق بی بی'' کو افسانہ مانا جائے یا نہیں اس کے لیے ایک پوری بحث درکار ہے۔ یہ قابل غور ہے کہ افسانہ کا اہم ترین جز 'وحدت تاثر' موجود نہیں ہے۔

''اتالیق بی بی'' میں کل ۱۴ رقصوں کو بیان کیا گیا ہے جس میں جاگیر دارانہ عہد کے زوال، اس وقت کی معاشرت اور تہذیب کو سلیقے سے پیش کیا گیا ہے۔ شوہر اور بیوی دو کرداروں کے ذریعہ خانگی زندگی کے حالات کو چابکدستی اور خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ اس میں ایسی مشرقی عورت کو مرکزی کردار بنایا گیا ہے جو کہ اپنے شوہر پر بے جا نکتہ چینیاں کرنے اور نامناسب شکوہ وشکایت کرنے کی عادی ہے۔ ''اتالیق بی بی'' میں چودھری محمد علی ردولوی نے گذشتہ تہذیب کی جھلکیاں دکھاتے ہوئے دو متضاد تہذیبوں کے تصادم کی واضح تصویر کشی کی ہے اور دونوں کے درمیان کے فرق اور اختلاف کو ابھارنے کی بھی سعی کی ہے۔ متن کی قرأت سے معلوم ہوتا ہے کہ محمد علی ردولوی صنفِ نازک کی نفسیات سے گہری واقفیت رکھتے تھے۔ بہرحال ۱۴ رمختلف قصے زبان وبیان کی وجہ سے دلچسپ بن گئے ہیں۔

چودھری محمد علی کی زبان وبیان اس دور کے مطابق ہیں جس دور میں یہ کتاب لکھی گئی ہے۔ خواتین اودھ کی زبان سے محمد علی ردولوی واقف تھے اور انھوں نے مرکزی خاتون کے کردار کے مکالموں میں اس کا بخوبی اظہار بھی کیا ہے۔ متروک الفاظ کا استعمال، روزمرہ اور محاورات کا برمحل استعمال ان کی تحریر کی خصوصیت ہے۔ مصنف نے اپنے اسلوب سے تحریر کو پرکشش اور پرلطف تو بنایا ہی ہے ساتھ ہی اسے طبع زاد کی صف میں بھی لا کھڑا کیا ہے۔ اس لیے ڈاکٹر شارب ردولوی کی اس بات سے اتفاق کیا جا سکتا ہے کہ ''کریٹن پکچرز'' سے متاثر ہوکر بھلے ہی یہ کتاب لکھی گئی ہو لیکن اس میں موضوع کے علاوہ اور کوئی چیز مشترک نظر نہیں آتی۔

چودھری محمد علی ردولوی نے یوں تو بہت کم ادبی سرمایہ چھوڑا ہے لیکن یہ بات انتہائی اہم ہے کہ ان کی ادبی خدمات کا اعتراف کیا جا رہا ہے اور ان پر کئی پی ایچ ڈی مقالے تحریر کیے جا چکے ہیں خود ''اتالیق بی بی'' کے مرتب ڈاکٹر انور حسین خاں نے بھی ان کی ادبی خدمات پر ہی اپنا پی ایچ ڈی مقالہ تحریر کیا ہے۔ حال ہی میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی نے ان کی کلیات کی اشاعت کی ہے نیز پاکستان میں بھی ان پر تحقیقی کام جاری ہیں۔ اس طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ ''اتالیق بی بی'' کی دوسری مرتبہ مرکز ثقافت وتحقیق علی گڑھ اور ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی کی بے لوث کوششوں کے سبب اشاعت اہمیت کی حامل تصور کی جائے گی جو کہ چودھری محمد علی ردولوی کی ادبی حیثیت کے تعین میں معاون ثابت ہوگی۔ کتاب میں ڈاکٹر طارق ایوبی ندوی نے مرتب ڈاکٹر انور حسین خاں کے اجمالی مگر جامع تعارف کے ذریعہ اس امید کو زندہ رکھنے کی کوشش کی ہے کہ ابھی ایمانداری کے ساتھ تحقیق کرنے والوں اور اپنے اسلاف کی عظمت کو بچانے والوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔

بعض پروف کی غلطیوں کو نظر انداز کر دیا جائے تو دیدہ زیب ٹائٹل کور عمدہ طباعت اور مناسب قیمت کے ساتھ نایاب متن کی اشاعت کے مدنظر کتاب کی طرف نئی نسل کو متوجہ کرنے میں مدد ملے گی۔

☆☆☆